برف میں چنگاری
ڈاکٹر عشرت بیتاب

برف میں چنگاری

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر عشرت بیتاب

پہچان پبلیکیشنز، ۱۔ برن تلہ، الہ آباد، ۲۱۱۰۰۳ (یو۔ پی) انڈیا

برف میں چنگاری

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر عشرت بیتاب

BARF MEIN CHINGARI

(Collection of Urdu Short Stories)

By:Dr.IshratBetab.

Nawaz Publication.

Zeb Kadah,Jahangiri Mohalla.

ASANSOL - 713302 (W.B)

ضابطہ:-

طابع اول:- ۲۰۰۲ تعداد:-ایک ہزار

ناشر:- نواز پبلی کیشنز، زیب کدہ، جہانگیری محلہ، آسنسول۔ ۷۱۳۳۰۲ (بنگال)

تقسیم کار

آسنسول:- تنویر بکڈپو، حنفی بکڈپو، نشاط بکڈپو۔ جی ٹی روڈ، نزد نیو سینما، آسنسول ۷۱۳۳۰۲

کلکتہ:- عثمانیہ بکڈپو، ۱۲۵ ر لور چیت پور روڈ، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۷۳

پٹنہ:- بک امپوریم:- سبزی باغ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

دہلی:- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

الہ آباد:- پہچان پبلی کیشنز، ۱/۲ برن تلہ، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

قیمت ۱۰۰ روپے

ترتیب
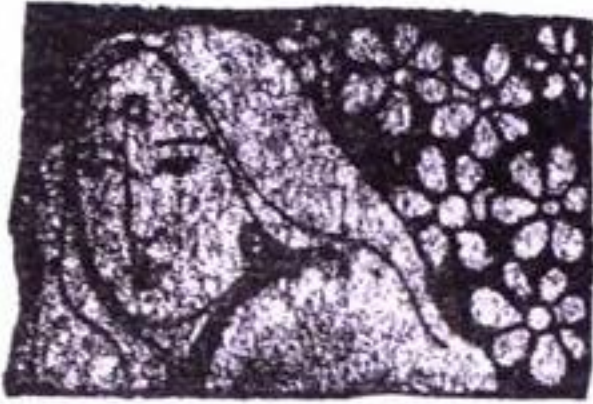
تعارف

- نام :- غلام عشرت ابن غلام مجتبیٰ
- قلمی نام : عشرت بیتاب
- پیدائش :- یکم جنوری ۱۹۵۲ بمقام۔ شیخپورہ (مونگیر)
- تعلیم :- ایم، اے۔ پی ایچ ڈی
- پہلی کہانی :- لاش پہ محل (افسانہ)
- رسالہ :- ماہنامہ شکیلہ (بمبئی) ۱۹۶۸ء
- کتابیں :----

- مغربی بنگال میں اردو افسانے کا سفر ۱۹۸۲ (تحقیق)

بنگال میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب، جو افسانوی انتخاب بھی ہے اور تاریخ بھی -

- ٹھنڈی آنچ کا سورج ۱۹۸۸ (افسانے)

چودہ نمائندہ، معیاری اور علامتی و تاثراتی افسانوں کا انتخاب (بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ سے انعام یافتہ)

- ابتداء ۱۹۹۰ (تحقیق)

آسنسول سب ڈویژن کے معروف افسانہ نگاروں کے پہلے افسانوں کا مجموعہ (بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ سے انعام یافتہ)

- بے ثمر حیات ۱۹۹۶ (افسانے)

چنیدہ افسانوں کا انتخاب (بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ سے اول انعام یافتہ)

- آموختہ ۱۹۹۶ (افسانے)

عشرت بتیاب کے ابتدائی افسانوں کا انتخاب (مرتب بلال عشرت)

برف میں چنگاری ۲۰۰۲ (افسانے) (تازہ افسانوں کا انتخاب)

- زیر ترتیب کتابیں

- بنگال میں اردو افسانے کی پیش رفت ۔ بنگال کے افسانہ نگاروں پر مقالے
- بنگال کے افسانوی ادب کا پچپن سالہ انتخاب

بنگال میں شائع شدہ افسانوی مجموعے کے ٹائٹل افسانوں کا انتخاب

- زیر اہتمام : نواز پبلی کیشنز، زیب کدہ، جہانگیری محلہ، آسنسول۔ ۷۱۳۳۰۲ (بنگال)
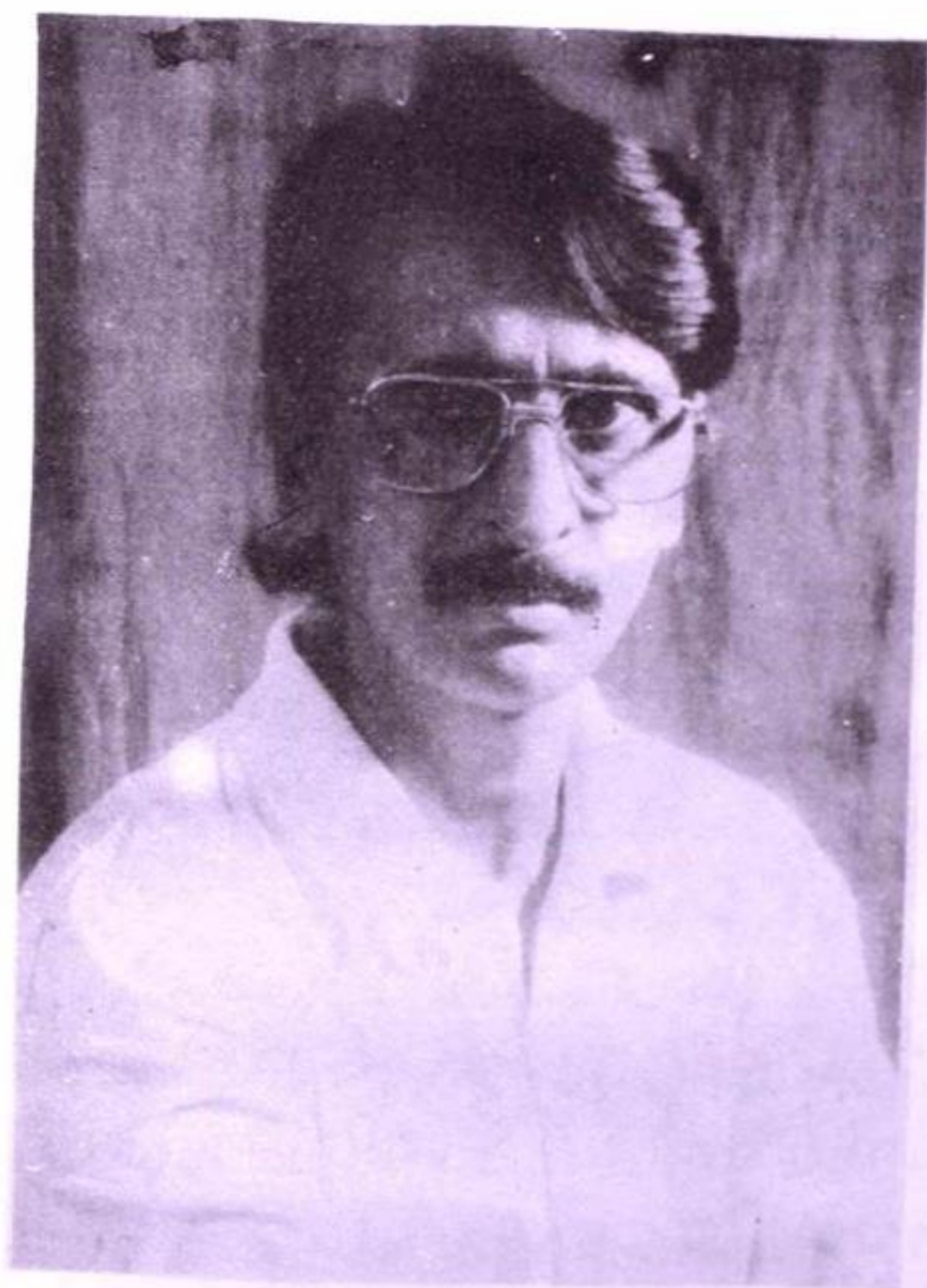
انتساب

محبِ اردو

محمد انور

کی نذر

اپنی باتیں

۱۹۵۲ء کی بات ہے مونگیر کے شہر شیخ پورہ میں غلام مجتبیٰ اور خاتون زیب النساء کی حیات میں از دو جی خوشیوں کی پہچان بنکر ایک بچہ آیا...... پورا گھر خوشیوں سے مہک اٹھا۔ اس بچے کا نام غلام عشرت رکھا گیا۔ وہی بچہ ۱۹۶۸ء میں بنگال کے کالے ہیروں کے شہر آسنسول میں عشرت بیتاب کے نام سے پہچانا گیا۔

متوسط گھرانا تھا صاحب حیثیت دولت کے معاملے میں بھلے نہ ہوں لیکن تعلیمی لحاظ سے پورا خاندان نہایت خوشحال تھا۔ دادا محترم گوہر علی کوئلے کے ٹھیکدار تھے۔ کوئلہ ٹھیکوں کے سلسلے میں اپنے بھائیوں دلدار حسین، حبیب الرحمن اور لیاقت حسین کے ہمراہ تقریباً ۳۴/۱۹۳۳ میں آسنسول آگئے تھے اور پھر کوئلے کی معقول آمدنی کیوجہ کر والد محترم غلام مجتبیٰ اور خاندان کے دیگر افراد بھی دھیرے دھیرے یہاں سکونت پذیر ہوئے۔

وہ آسنسول کی نئی فضا میں ڈگمگاتے قدموں سے ابھی دو قدم چل بھی نہ پایا تھا کہ ایکدن والدہ محترمہ بیمار ہو گئیں۔ علاج شروع ہوا مگر مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی...... وقت گذرتا رہا اور وہ زندگی کی آخری منزل تک پہنچ گئیں اور پھر ایکدن آسمان کی طرف پرواز کر گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گھر تو سونا ہوا ہی۔ غلام عشرت بھی اجڑ گیا۔ ماحول کی کبیدگی رفتار زمانہ کا ساتھ نہ دے سکی۔ غلام عشرت کی اداسی دادی اماں کو دیکھی نہ گئی انہوں نے بڑھ کر اپنی ممتا کے آنچل میں چھپالیا۔ چچازاد بڑی بہنیں جہاں آرا اور حسن آرا نے شفقت نچھاور کیں اور اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ توتلی زبان سے ہی اللہ اور اس کے رسول صلعم کی شناخت کرائی اور جب وہ اپنی چچازاد بڑی بہنوں کی انگلیوں کے سہارے چلتے چلتے آنگن کی حدود پار کرنے لگا تو اسے اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب کا سبق از بر کرایا گیا۔

پھر رحمانیہ اسکول، آسنسول کے پرائمری سیکشن میں داخلہ ہوا۔ جہاں ہائیر سکنڈری تک کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد پڑوسی صوبہ بہار کے بی ایس کالج مائی تھان سے بی اے اور پھر رانچی یونیورسٹی (موجودہ جھارکھنڈ صوبہ) سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔

شہر آسنسول کی تعلیمی وادبی فضا نے عشرت بیتاب کی تحریروں میں بے چینیاں بھر دیں اور وہ متوازن رفتار سے سفر در سفر کرتے ہوئے کئی کتابوں کا بلاشرکت غیرے مالک بن گیا۔

اس طرح اس کی ادبی تراش وخراش بنگال کی ادبی فضا میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں بنگال کی بھوکی پیڑھی کا درد، مزدور ورکروں کی اشتراکی کیفیات، بنگال کی مشینی زندگی کی گڑگڑاہٹ، کول مئینس کے مزدوروں کی چیخ وپکار اور یہاں کے احتجاجی جلسوں کے شور آپ کو صاف سنائی دیں گے۔

قلمی سفر میں بزرگوں، ہم عصروں اور دوستوں نے ہمت افزائی اور حوصلہ بندی کا سلسلہ جاری رکھا اور قلمی رہنمائی اور حد بندی سکھائی۔ قابل صد احترام بزرگ حضرت سالک لکھنوی نے فرمایا:۔

''وہ ذہنی طور پر ترقی پسند ہیں لیکن اسلوب میں جدت پسندی نمایاں ہے۔ ان کے افسانے ترقی پسندی اور جدت پسندی کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ ان کے علامتی افسانے گورکھ دھندا نہیں ہوتے سمجھ میں آتے ہیں اور افسانہ نگار کا وہ مقصد پورا ہوجاتا ہے جس کیلئے افسانہ لکھا گیا''

اس سلسلے میں کلکتہ کے پروفیسر شاہ مقبول احمد بھی ایک جگہ رقم طراز ہیں:۔

''ایک جواں ہمت اور تازہ کار ادیب عشرت بیتاب کی تلاش وجستجو کے ذوق بے پایاں نے ایک ایسا قابل فخر مرقع ہمارے لئے مرتب کردیا ہے جس میں عہد بہ عہد کے فنکاروں کا ذکر شایان شان طور پر کیا گیا ہے۔

افسانہ کے رموزفن اور افسانہ نگار کی روح تک پہنچنے میں موصوف بجا طور پر کامیاب ہوئے ہیں''

اردو کے معروف شاعر محب الرحمان کوثر کے خیالات کچھ اس طرح ہیں:۔

''اس نے افسانوں میں ہیئتی اور تکنیکی تجربے بھی کئے خوبصورت جملے بھی تراشے ہیں اور

فلسفیانہ خیالات بھی پیش کیے ہیں اس کے افسانوں میں تلمیحی اشارے بھی ہیں اور استعاراتی انداز بھی۔ اسے سماج کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کا فن بھی خوب آتا ہے"

محترم فیروز عابد اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں انہوں نے ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عشرت بیتاب نے اپنے گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہو کر اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار ان کہانیوں میں کیا ہے کچھ کہانیاں ہندو مسلم اتحاد، ذات پات کے بھید بھاؤ اور قومی یکجہتی پر ہیں عشرت بیتاب زندگی کی بے رحم حقیقتوں کا اظہار بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کرتے ہیں"

'چپ فضا میں عذاب' کے خالق نذیر احمد یوسفی کے خیال میں:۔

"عشرت بیتاب محقق، نقاد اور افسانہ نگار ہے اس نے کلاسیکی، روایتی اور ترقی پسند ادب کی سیڑھیاں بتدریج پھلانگی ہیں اور علامت اور جدت کے بلند منارہ پر لایعنیت اور ابہام کے لہولہان کر دینے والی ٹھوکروں سے خود کو بچتے بچاتے ہوئے اپنے مقام کا تعین کیا ہے اور قدم جمانے کی کوشش جاری ہے" بنگال کے

کالے ہیرے کا نمائندہ شاعر رونق نعیم رقمطراز ہے:۔

"آپ کے ہاں تخلیقی شعور کی کمی نہیں صاف ستھری زبان اور تر و تازہ بیان کی دل آویزی کی وجہ سے آپ کے افسانے اپنی جانب کھینچتے ہیں بے نور آنکھیں، آپ کی لازوال تخلیق ہے یہ اردو کے افسانوں ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے آپ اسی افسانے کی وجہ سے ادبی دنیا میں زندہ رہیں گے اس میں کوئی کلام نہیں"

یہ پانچواں مجموعہ "برف میں چنگاری" زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے روبرو ہے حالات کے نشیب و فراز سے گذر کر زندگی کے مختلف تلخ و شیریں تجربات و مشاہدات سے افسانوں میں زندگی آمیز اور زندگی آموز رنگ بھرنے کی مکمل اور بھرپور کوشش ہی کارفرما ہے اور یہ کوشش کتنا کامیاب ہے یہ آپ کی صوابدیدہ پر منحصر ہے اور کچھ نہیں ہے!

◆◆◆

تاڑ کی چھاؤں

تاڑ کی چھاؤں

صادق کا زیادہ تر وقت اب گھر پر ہی گذر رہا تھا کیونکہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اس نے اپنے مکان کے برآمدے میں ہی پی، سی، او لگا لیا تھا۔ گاہکوں کے جانے کے بعد جب ذرا فرصت ملتی تو برآمدے سے ملحق کمرے میں آکر آرام سے لیٹ جاتا۔ جب تک ملازمت تھی، اسے جسمانی کمزوری کا احساس نہیں تھا۔

شروع شروع میں پی سی او میں بطور ڈیوٹی بیٹھنا اسے ناگوار گذرتا تھا کہ ہرا یرا غیرا بغیر کسی اجازت آکر کرسی پر بیٹھ جاتا اور پھر نہایت سطحی باتیں کرنے لگتا۔ ایک وقت تھا جب اس کے چیمبر میں داخل ہونے کیلئے اجازت کی پرچی بھیجنی پڑتی تھی اور وہ پرچی پر لکھے شخص کے نام اور اس کی ضرورت کے پیش نظر ہی اسے اندر آنے کی اجازت دیتا تھا کہ اس کا وقت بڑا قیمتی تھا اور ذمہ داری سخت!

لیکن وقت کی آندھی نے اسے تنکے کی طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا، شخصیت کی یہ ٹوٹ پھوٹ دیکھکر اسے خود پر افسوس ہوتا لیکن اس مجبوری کو گلے لگانا ہی تھا۔ وقت یکساں کب رہا ہے حالات کی چکی میں سبھوں کو پسنا پڑتا ہے۔

کبھی کبھی وہ اپنی شخصیت کو یوں بکھرتا دیکھ کر نڈھال ہو جاتا کہ خاموش اور کم گو صادق اب دھیرے دھیرے باتونی ہوتا جا رہا تھا۔ بات پیدا کرنا، غیر ضروری گفتگو میں الجھے رہنا، اب اس کا مشغلہ بن گیا تھا کہ یہاں ہر آنے جانے والا شخص اس سے کسی نہ کسی موضوع پر تبصرہ

ہی چاہتا۔ اُسے اب برا بھی نہیں لگتا کہ اس سے اس کا وقت بھی کٹ جاتا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا سڑکوں کی گہما گہمی میں کمی آ گئی تھی اس لیئے وہ برآمدے میں لگے شڑ کو نصف گرا کر اندرونی کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ سامنے صوفے پر بیگم گم صم بیٹھی تھی اداس اداس، کسی سوچ میں غرق کہ اسے صادق کی آمد کا احساس تک نہ ہوا۔

''ریحو اندنوں کافی اداس رہنے لگی ہے'' صادق نے دل ہی دل میں سوچا بچوں کی جدائی سے ریحو بالکل ٹوٹ سی گئی ہے۔ صحت بھی اندنوں کافی گر گئی ہے۔ صادق کے خیال میں وقت اور حالات کے بےرحم شکنجوں نے اس کی ریحو کو بالکل گیلے کپڑوں کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حاشیے کا نمایاں ہونا اور چہرے پر کی جھریاں صادق کو مایوسی کی دلدل میں دھکیل رہی تھیں لیکن فوراً اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ تبھی آنکھوں کے سامنے ریحو کی وہ تصویر ابھر آئی۔

بڑی بڑی آنکھیں، گول مٹول چہرہ، سڈول جسم اور صاف رنگت والی ریحو سامنے کھڑی تھی صادق کے ہونٹوں پر بے ساختہ یہ گیت پھسل آیا اور وہ پلنگ سے اٹھ کر بیگم کو چھیڑتے ہوئے گنگنانے لگا ——

''اے میری زہرہ جبیں تجھے معلوم نہیں
تو ابتک ہے حسین اور میں جواں......''

ریحو ناراض ہوتے ہوئے بولی ——

''آپ کو اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اور ہم بیزار بیٹھے ہیں''

ریحو کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں شاید، اسی لئے اس کی آواز بھی رندھی ہوئی تھی۔ کہنے لگی ——''دیکھئے نا —— رانی بھی کوئی خط نہیں لکھتی اور نہ شبو ہی اپنی خیریت لکھتا ہے۔ کبھی کبھار ایک فون کر دیا اور بس!'' صادق کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ واقعی! دونوں بچوں نے ماں باپ کو بالکل بھلا دیا ہے۔ بچوں کی جدائی کا احساس شدید ہوا تو وہ بڑی طرح نڈھال ہو گیا —— گھر

میں رونق تو بچوں کی کلکاریوں سے ہی ہوتی ہے اس کے بغیر تو درو دیوار سے بھی اداسیاں ٹپکنے لگتی ہیں۔

برسوں گذرے لیکن لگتا ہے کل کی بات ہو۔ رانی اس کی گود میں کھیل رہی تھی۔ توتلی اور میٹھی زبان والی رانی............ یوں تو ریحو کو لڑکے کی خواہش تھی شاید اسی لئے بچی کی آمد پر اس کے چہرے کا روغن کچھ اتر سا گیا تھا لیکن صادق کی تسلی دینے پر اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

"ریحو......اوپر والے کی عنایت پر شکر ادا کرو، ورنہ کتنے گھروں کا آنگن بن بچے سونے رہ جاتے ہیں اور پھر نہ جانے کتنی درگاہیں اور کتنے پیر فقیر کی چوکھٹ کی دھول چاٹنی پڑتی ہے اور ویسے بھی لڑکی تو ھندی سبھتا کے انوسار لکشمی مانی جاتی ہے"

اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی پیدائش کے بعد ہی صادق کا پرموشن ہوا تھا اور گھر کی کچی دیواریں آہستہ آہستہ جدید خدوخال پا گئی تھیں اسی درمیان شبو بھی آ گیا اس کی آمد پر ریحو بھی خوش تھی اور گھر کے افراد بھی............ معلوم نہیں کس نے یہ ریت بنا رکھی ہے کہ لڑکے کو ہی وارث تصور کیا جاتا رہا ہے۔

ریحو اسے دھوپ کی گرمی، سردی کی ٹھنڈک اور برسات کی مرطوب ہواؤں سے کس کس طرح محفوظ رکھتی کہاں تک بیان کروں۔ اپنے کومل آنچل میں ہمیشہ چھپائے رکھتی کہ کسی کی نظر بد نہ لگ جائے............ ہمیشہ کہتی............ "اتنا بولتا ہے اور ایسی ایسی معصوم حرکتیں کرتا ہے کہ ہر کوئی متحیر نظروں سے دیکھنے لگتا ہے کہیں میرے لال کو کسی کی نظر نہ لگ جائے" تب اس کی پیشانی کے ایک گوشے میں کاجل کی بندیا لگا دیتی۔

صادق کو اپنی نانی اماں کی یاد آ گئی............ وہ بھی صادق کو کس طرح سینے سے چمٹائے رکھتی تھی۔ صادق کی والدہ بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی وہ تو نانی اماں کی شفقتوں اور نوازشوں کے سائے تلے پل بڑھ کر جوان ہوا تھا کہ بابا نے دوسری شادی کر لی تھی اور سوتیلی ماں

!صدیوں بعد بھی اپنی کینچل نہیں اتار پائی تھی سوتیلی ماں کے نازیبا سلوکوں کی وجہ سے نانی اماں صادق کو اپنے ساتھ لے آئی تھی ،۔ اپنی اکلوتی بچی کی آخری نشانی کو یوں ذلیل وخوار ہوتے دیکھنا برداشت نہیں کر پائی تھی۔

نانی اماں صادق کی خوب خوب سیوا کرتی ۔ اپنے ہاتھوں نہلاتی ۔ دھلاتی اور سجاتی سنوارتی رہتی اور اکثر کہتی میری روشن کی تو بس ایک ہی نشانی ہے میری روشن کے نام کو تو ہی زندہ رکھے گا ۔ تجھ سے ہی اس کا ونش چلے گا ۔ تو نہیں جانتا بیٹا ، نانی کہتی .... ''مکئی کے ایک دانے سے سینکڑوں دانے والا بھٹا نکلتا ہے''

سچ ہے ، صادق سوچتا .... میں اپنی ماں کا تنہا چشم و چراغ تھا اور اب میرے ......

ریحو ابتک سوچ میں مستغرق تھی ۔ صادق اسے ہر زاویے سے سمجھاتا کہ اب فکر کی ضرورت نہیں بچے بڑے ہو گئے ہیں مثال کیلئے مرغی اور چوزوں کا حوالہ دیتا ....

''مرغی اور اس کے چوزوں کو تم نے کبھی غور سے دیکھا ہے وہ اپنے بچوں کو ایک مخصوص مدت تک ہی اپنے پروں میں سمیٹے رکھتی ہے جہاں قوت پرواز کا اندازہ ہوا وہ اسے خود ہی اپنی چونچ سے ٹھونک ٹھونک کر دور رہنے کی تلقین کرتی ہے اور ہمارے بچے تو بہر حال اشرف المخلوقات کے زمرے میں آتے ہین جس کے اندر رب نے بے پناہ صفتیں بخشی ہیں''

ریحو پر صادق کی باتوں کا کچھ اچھا ہی اثر ہوا تب ہی وہ اٹھی اور ظہر کی نماز کیلئے اپنے محبوب حقیقی کے آگے سر بسجود ہو گئی بیشتر نمازوں میں وہ گھٹنوں دوزانو بیٹھی اپنے رب سے بچوں کی خوشحالی و ترقی کیلئے دعائیں مانگتیں۔

صادق کو ریحو کی اس سنجیدہ و مطیع طبعیت کا احساس پہلی بار ہوا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہ وہی شوخ و چنچل ریحانہ ہے جو کالج کے دنوں میں ہر لمحے مچلتی اور تھرکتی رہتی تھی ۔ ہر مقابلے میں نمایاں مقام حاصل کرتی تھی ۔ چاہے وہ ڈبیٹ کمپٹیشن ہو یا بیت بازی کا مقابلہ یا پھر امتحانات ہوں۔

صادق تو اس کی شوخ اور چنچل اداؤں کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ قربتیں بڑھتی گئیں اور پھر محبت کی پر پیچ گلیوں کو عبور کرتے دیر نہیں لگی کہ ریحانہ اس کی زندگی میں ریحو بن کر اتر آئی۔

نانی خوش تھی کہ صادق کی خوشی ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ مقصد بر آتے ہی نانی اماں نے اپنا رخت سفر باندھ لیا اور اپنے معبود حقیقی سے جا ملی۔

ریحو نماز سے فارغ ہو چکی تھی اور کافی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی دونوں نے ایکساتھ بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کی میز پر وقفے وقفے سے رانی اور شبو دونوں بچوں کی شوخیوں کا والہانہ ذکر کرتے رہے۔

رانی نے مدھیا مک میں شاندار کامیابی کے بعد تعلیمی سلسلہ ترک کر دیا تھا کہ اس کے سسرال والوں کو لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا پسند نہیں تھا وہ کہتے کہ لڑکیوں کو بس ایک حد تک تعلیم دلانی چاہیئے۔ رانی کا خاوند جاوید ایئر فورس میں تھا اور شادی کے بعد وہ رانی کو ساتھ ہی رکھتا جہاں اس کی پوسٹنگ ہوتی رانی ہمراہ ہوتی۔ ویسے رانی جہاں بھی رہتی اپنے ابو امی سے رابطہ قائم رکھتی۔ وہ اکثر فون اور کبھی خط سے اپنی امی کو اپنی خیریت سے مطلع کرتی رہتی۔ اس طرح اس کی قربت کی خوشبو سے صادق اور ریحو ہمیشہ معطر رہتے۔

شبو کی شادی بھی رانی کیساتھ ہی ہوئی تھی یہ سوچ کر کہ بہو کی موجودگی میں بیٹی کی عدم موجودگی کا احساس کم ہوگا۔ لیکن ساری تدبیریں الٹی پڑ گئیں۔ شبو کو بکارو اسٹیل سیٹی کے بڑے سے فلیٹ میں تنہا رہنا گوارا نہ تھا انجیئرنگ کورس کی تکمیل ہوتے ہی اس کی بکارو اسٹیل فیکٹری میں تقرری ہو گئی تھی جب اس نے اپنی پریشانی کا ذکر اپنی ماں سے کیا تو شفقت کی پوٹلی ریحو کا دل پسیج گیا اور پھر صادق کی رضامندی کا مہر ثبت کرانے میں دیر کتنی لگتی۔

ایک دن شبو کے یہاں نئے مہمان کی آمد کی خبر ملی۔ صادق اور ریحو کی باچھیں کھل گئیں۔ سوچا اب اس آنگن میں ایک بار پھر بچے کی کلکاریوں کی گونج سنائی دے گی۔ یہ سوچ کر دونوں نے رخت سفر باندھا کہ بہو اور بچے کو کچھ دنوں کیلئے لیتے آئیں گے لیکن یہاں پہنچ کر شبو سے

گفتگو کے بعد دونوں میاں بیوی کے پاؤں تلے کی زمین ہی نکل گئی۔ شبو کہنے لگا۔ امی اس ماہ کے آخری عشرے میں ہم دونوں کا پرواز ہے۔ کمپنی جدید ٹکنالوجی کی ٹرینگ کیلئے مجھے امریکہ بھیج رہی ہے اس ٹرینگ سے ہماری شخصیت ہی بدل جائے گی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اتنے سارے لوگوں میں ہمارا انتخاب ہوا ہے اور وہاں ہم دونوں کے رہنے کا انتظام بھی کمپنی کے کاندھے پر ہی ہوگا۔''

صادق اور ریحو اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ بیٹے کی خواہش پر حرف لگانا مناسب نہ تھا کہ بچوں کی بلند پروازی سے تو والدین کو بھی خوشی ملتی ہے۔

آج اچانک ٹی وی پر اس دہشت ناک خبر سے دونوں لرز اٹھے۔ ٹی وی پر امیریکہ کے دراز قد، بلند قلعے کو منٹوں میں ہی زمین بوس ہوتے دکھایا گیا تھا۔ صادق تو مضبوط کاٹھی کا مرد تھا خود کو سنبھالے رکھا لیکن ریحو کی صنف نازک صحت پر برا اثر پڑا۔ وہ تقریباً نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑی۔ دیکھتے دیکھتے سارا بدن گرم تاوے کی طرح تپنے لگا.......... صادق نے فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ مگر جوں جوں دوا کی مرض بڑھتا گیا کہ مصداق ریحو کی طبعیت بگڑتی چلی گئی۔

رات بھیگ چلی تھی اور رات کی سیاہی سارے کمرے میں پھیل چکی تھی۔ صادق اپنی ریحو کے سرہانے بیٹھا صبح کی پر امید کرن کے طلوع ہونے کا منتظر تھا۔

اچانک ریحو کی نبض ڈوبنے لگی، آنکھیں بھی پتھرا گئیں۔ سانسیں بھی اکھڑ اکھڑ کر چلنے لگیں۔ صادق گھبرا گیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اپنے ہمسفر کو اپنی دسترس سے چھوٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جدائی کے احساس سے ہی سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ بڑی ہمت کر کے صادق اٹھا.......... اور پی سی او کے کاؤنٹر تک آیا اور اپنے لخت جگر کا فون نمبر ملایا۔

''تم کیسے ہو بیٹا۔؟ وہاں کے حالات تو نہایت تشویش ناک ہیں'' صادق نے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے اتنا ہی کہہ پایا'' پاپا.......... آپ میری فکر نہ کریں۔ ہم لوگ محفوظ ہیں'' بیٹے

نے تسلی دیتے ہوئے اپنے پاپا سے کہا'' تم فوراً چلے آؤ.......... یہاں تمہاری امی فکرمند ہے اور طبیعت بھی ٹھیک نہیں'' صادق نے ہمت کر کے اپنی بات کہدی'' پاپا! اس وقت یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔ ابھی یہاں سے کسی کو بھی پرواز کی اجازت نہیں مل سکتی اور پھر ہم لوگ تو شک کے دائرے میں مقید ہیں'' بیٹے نے لاچاری ظاہر کی۔

صبح ہوتے ہوتے رانی آچکی تھی وہ امریکہ کے ٹاور دھماکے کی خبر سن کر اپنے ابو، امی کو تسلی دینے چلی آئی تھی لیکن یہاں کا منظر دیکھکر وہ ششدر رہ گئی۔ امی کی حالت نازک دیکھکر وہ اس سے لپٹ گئی۔ امی کا جسم سرد ہوا جا رہا تھا اور پاپا کی حالت بھی دیگرگوں تھی۔ وہ چیخ مار کر رو پڑی۔

بیٹی کی چیخ پر صادق، ریحو کے بستر کے قریب سمٹ آیا۔ صادق کو ریحو کے بستر تک پہنچتے پہنچتے ریحو کی روح پرواز کر چکی تھی۔ رانی اس سے چمٹی زاروقطار رو رہی تھی۔ چیخ کی آواز سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ بھی آپہنچے۔

جنازے کو غسل دیا گیا اور پھر سارے کمرے میں کافور کی بو پھیل گئی۔ آخری دیدار کیلئے لوگ رشتہ دار اُمڈ پڑے۔ صادق کو بھی حاضری دینی تھی.......... لیکن اس میں اتنی سکت کہاں تھی وہ بت بنا دور کھڑا اپنی ریحو کو ایک ٹک دیکھتا رہا.......... شاید بدحواسی میں ریحو کی آنکھیں بند کرنا لوگ بھول گئے تھے۔ صادق کو ریحو کی آنکھوں میں وارث کے انتظار کا کرب صاف دکھائی دے رہا تھا..........

پھانس

پھانس

اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی اسے کسی صورت چین نہیں مل پا رہا تھا............وہ ادھر کچھ دنوں سے ایک انہونی کیفیت سے دوچار تھی یوں تو اسکول کے دنوں میں بھی کئی بار ......مگر ادھر وہ کچھ زیادہ ہی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ سارے جسم میں تناؤ محسوس کرتی اور پھر سر اور کمر میں شدید درد کا احساس ہوتا۔ تب وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتی اور پھر صبح سے شام تک، درد کی بے چینی سے دوچار رہتی۔ ایسی صورت میں سر درد کی دوا ایک گولیاں کھالیتی، اس طرح جسم کے تناؤ اور کمر و سر کے درد میں کچھ کمی تو آجاتی لیکن مکمل آرام کہاں مل پاتا۔

"کسی ڈاکٹر کو دکھاتی کیوں نہیں؟" پاس بیٹھے مرد ساتھی نے کہا۔

"ڈاکٹر کیا کرے گا...... یہی درد کی گولیاں دے گا، اور کیا؟" لڑکی نے اپنے مرد ساتھی کے مشورے کو ایشٹرے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اس اضطرابی کیفیت کو میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ادھر جب بھی تم سے ملنے آیا، تمہیں پریشان ہی پایا۔" مرد ساتھی نے لڑکی کی تیزابی کیفیت پر پھاہا رکھتے ہوئے کہا۔

ہاں "! ادھر کچھ دنوں سے زیادہ پریشانی محسوس کر رہی ہوں" لڑکی نے گول مٹول جواب دیا۔

"کب سے؟" مرد ساتھی نے گہرائی میں اترنے کی کوشش کی۔

''وہ تو ٹھیک سے یاد نہیں کہ پہلی بار کب اور کس صورت میں اس کیفیت سے دوچار ہوئی تھی لیکن ہاں! اسکول کے مدھیامک امتحان کے دوران، جب پہلی بار مینسوریشن پیڈ Menstrual Pad کی ضرورت کو محسوس کی تھی اور جہاں تک یاد پڑتا ہے اس کے استعمال کے بعد ہی سے میری طبعیت میں .... یعنی ایسی کیفیت پیدا ہوتی رہی ہے'' لڑکی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے اپنے غمخوار مرد ساتھی کو بتایا۔

''تو پھر کسی گائینو سے تشخیص کرانی چاہیے تھی'' مرد ساتھی نے مشورہ دیا۔

''گائینو کو کیا دکھاؤنگی'' لڑکی نے قدرے شرماتے ہوئے، مرد کی طرف دیکھا۔

لیکن مرد ساتھی نے لڑکی کے لاکھ انکار کے باوجود اسے ڈاکٹر کے حوالے کر ہی دیا۔

ڈاکٹر مریضہ کی گفتگو کو غور سے سنتا رہا پھر آلہ سے مریضہ کے جسم کو ٹٹولا .... تب گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ ہر طرح کے معائنے اور تشخیص کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا ،سوچا!۔ ممکن ہے کسی حادثے کی وجہ کر جسمانی تناؤ اور کرب محسوس کر رہی ہو۔،

ڈاکٹر نے مریضہ پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔'' آپ اپنے ذہن پر زور دیجئے۔ کہیں،۔ کبھی کوئی حادثہ کوئی واقعہ پیش آیا ہو...... پیچھے، بہت پیچھے گزرے ہوئے لمحوں کو ٹٹولئے''

مریضہ آنکھیں بند کئے، ماضی کی بھول بھلیوں میں کچھ دیر بھٹکتی رہی پھر گویا ہوئی......

''یہاں بھی میرے ساتھ میرا مرد ساتھی ہے اور کالج کی ڈھیر ساری سہیلیاں ہیں سبھی سہیلیاں ایک دوسرے کو چھیڑ رہی ہیں۔''

''غور کیجئے، اس چھیڑ چھاڑ میں کہیں کوئی کیل پھنسی ہو .... مجھے اس چھیڑ چھاڑ کی تفصیل بتایئے'' ڈاکٹر نے مریضہ کو ہدایت دی۔

''میری بنو! کالج کے ایگزام کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' پہلی سہیلی نے کہا۔

''گھر بسانے کا، اور کیا!'' منجلی سہیلی نے جواب دیا۔

''بہن، چولھا چکی سے مجھے سخت نفرت ہے'' دوسری نے ٹھوکا لگایا اور کہا۔

''مجھے تو آگے پڑھنا ہے ایم۔اے اور پھر پی ایچ،ڈی کرنی ہے''

''میں تو اپنے مرد ساتھی کیساتھ دنیا کی سیر کرونگی'' یہ مریضہ کی اپنی رائے تھی۔

ٹھیک اسی وقت اس کا مرد ساتھی کمرے میں داخل ہوتا ہے............

''کیوں، کیا ہو رہا ہے یہاں......تم ساری سہیلیاں ایک جگہ جمع ہو کر کس موضوع پر بحث کر رہی ہو۔ مجھے بھی شریک بزم کر لو''

''میں تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔ تمہارا مضبوط ہاتھ تھام کر، میں دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں'' مرد ساتھی کو دیکھتے ہی لڑکی نے کہا۔

''تمہارا وہ مرد ساتھی یہی ہے نا'' ڈاکٹر نے مرد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''جی ہاں! یہ وہی مرد ساتھی ہے جو کبھی کالج کی دہلیز اور زینے پر میرا ہمقدم ہوا کرتا تھا اور اب دفتری الجھنوں میں بھی میرا پورا پورا ساتھ نباہ رہا ہے میں دنیا کی سیر تو نہیں کر سکی، لیکن دفتر کی کاغذی پیچیدگیوں کو ساتھ ساتھ ہی جھیل رہی ہوں۔ یہ میرا بہت خیال رکھتا ہے میری ضرورتوں پر نگاہ رکھنا اور خواہشوں کا احترام کرنا اس کی ہابی HOBBY ہے'' مریضہ لڑکی نے ایک ہی سانس میں اپنے مرد ساتھی کی پوری کیفیت سے آگاہی دے دی۔

ڈاکٹر مریضہ کی کیفیت پر گرفت نہیں لگا پا رہا تھا.............کبھی وہ اس کی آنکھوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا تو کبھی جسم کے حرکات و سکنات کو، وہ کسی بھی صورت کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

تمہیں ایک بار پھر پیچھے، بہت پیچھے، بچپن کی کچی دہلیز میں قدم رکھنا ہوگا۔

مریضہ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو ماں کی کومل گود کے حوالے کر دیا............

''وہ نٹ کھٹ، شریری بچی ماں کی گود سے اترنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے، ڈاکٹر''

''اسے غور سے دیکھو......وہ گود سے اتر کر کہاں جاتی ہے اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھو'' ڈاکٹر نے مریضہ کو ہدایت دی۔

''وہ ماں کی گود سے اتر کر اب باپ کی گود سے چپک گئی ہے بڑی ضدی بچی ہے بڑی ناہموار

بچی لپکتی ہے گود سے اترتی ہی نہیں۔ بڑی شوخ بچی ہے، زمین پر پاؤں رکھتی ہی نہیں''۔

''اب دیکھو!'' ڈاکٹر نے ایک بار پھر مریضہ کو بچپن کی بھول بھلیوں میں غوطہ زن ہونے کو کہا۔

''اب اس کے والدین درس گاہ میں اسے داخلہ کیلئے لے جا رہے ہیں۔ اسے مدرسے میں داخل کر دیا گیا ہے ...... تین، چار، گھنٹے کے درس گاہ کی قید سے بچی سہم سی گئی ہے ایسی صورت میں گھر کے بزرگ اسے باغ کی سیر کیلئے لے جا رہے ہیں۔ طبعیت بہل جاتی ہے، تازگی لوٹ آتی ہے بچی خوش ہے اور ایک بار پھر ماں کی گود......''

ڈاکٹر اس بار بھی مایوس رہ جاتا ہے تشخیص کے تمام راستے بند پڑ جاتے ہیں۔ ذہن کے دریچے سے ایک آواز ابھرتی ہے۔

''آپ کو فوراً شادی کر لینی چاہئے'' ڈاکٹر نے تجویز پیش کی۔

''کیوں؟'' مریضہ ہکا بکا رہ گئی۔

''اس طرح ذہنی آسودگی سے ممکن ہے جسمانی تناؤ پر قابو پا سکیں'' ڈاکٹر نے اپنی رائے دی۔

اور پھر مریضہ نے اپنے مرد ساتھی کا ہاتھ تھام لیا۔ مرد ساتھی اس کے نرم و گداز ہتھیلیوں کی گرمی سے دہک اٹھا...... اس نے پہلی بار اس کے نرم و گدرائے جسم کی بھینی بھینی خوشبوؤں کو اس قدر قریب اور شدت سے محسوس کیا۔ جواں جسم کی خوشبو اسے قریب سے قریب تر کھینچتی چلی گئی۔ دونوں کی قربت سے آتشی چنگاریاں پھوٹ پڑیں اور پھر دونوں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو گئے کہ سانسوں کی تکرار سے سنگیت کی ایک نئی لہر سی پیدا ہو گئی اور پہلی بار محبتیں، اجنبیت کی حدیں پھلانگ گئیں۔

تب روشن بلب نے آنکھیں موند لیں اور نائٹ بلب کی دھیمی اور میٹھی روشنی کمرے کی بساط پر پھیل گئی...... نائٹ بلب کی دھیمی دھیمی، سرمئی روشنی میں مرد، عورت پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا گیا۔ گجر نے بارہ کی گھنٹی بجائی۔ عورت چیخ اٹھی۔

''ڈاکٹر''...... عورت ہانپ رہی تھی۔

''اس دن، دن کے اُجالے میں، وہ بھی .... جب میں بالکل ننھی سی تھی۔ اسکول سے واپس آ رہی تھی۔ وہ سر پھرا۔ میرے قریب آیا اور مجھے اپنی گود میں اٹھالیا اور پھر ایک خستہ سی دیوار کے پیچھے لے جا کر، میری ننھی سی جان کو بے تحاشہ چومنے لگا.......... میرے مرد ساتھی کی طرح، اس نے مجھے پوری قوت سے دبوچ لیا تھا۔ میں اپنی سدھ بدھ کھوئے گھنٹوں بے ہوش پڑی رہی۔۔ نیند ٹوٹی تو روتے روتے ماں کی گود میں جا دبکی'' عورت بولتے بولتے رو پڑی۔

''گھبرانے کی بات نہیں، اپنے آپ پر قابو رکھو'' ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک حادثہ تھا.......... اسے بھول جاؤ''

دوسری صبح مرد ساتھی اپنی شریک حیات کے غموں کا حصہ بن گیا تھا کہ اب جسمانی تناؤ دم توڑ چکا تھا۔..........

قبر

قبر

وہ ایک بار پھر اپنی قوت کو سمیٹ کر ماں کیلئے قبر کھودنے میں لگ گیا...... لیکن آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے وہ لاکھ کوششوں کے باوجود اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پا رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو سیلاب کی صورت امنڈتے چلے آ رہے تھے جسے وہ چند لمحے رک کر اپنی قمیض کی میلی آستین سے پونچھتا اور پھر قبر کھودنے میں لگ جاتا۔ وہ مٹی کی سختی میں خود کو تحلیل کر دینا چاہتا تھا۔

اس سے قبل وہ کتنی ہی قبریں کھود چکا تھا۔ سینکڑوں کیلئے قبریں کھودنے والا آج اپنی ماں کیلئے دو گز زمین نہیں کھود پا رہا تھا۔

''سچ ہے دوسروں کیلئے گڑھے کھودنا کتنا آسان ہے'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

''ہاں، اس لئے کہ اس میں ممتا میں گوندھی ہوئی موہنی صورت سامنے نہیں ہوتی'' ضمیر کی آواز ابھری۔

ماں کا شکنوں بھرا مضمحل چہرہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ابھر آیا............

وہ اپنی ماں سے کبھی ایک دن کے لئے بھی دور نہیں رہا تھا اس کے کومل ہاتھوں کی تپش میں ہی وہ پل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ اس کی نظروں میں ضرورت کی تمام چیزوں کو مہیا کرنے والے کا نام باپ ہے لیکن ماں تو بند پپوٹے سے لیکر کھلی آنکھوں کی رنگین صورتوں تک ہر لمحہ ممتا نچھاور کرنے والی عورت کا نام ہے۔

اس عورت کو وہ کیسے بھول سکتا تھا جس کی کوکھ میں وہ نو مہینے نہ صرف رہا بلکہ اس کا خون چوس چوس کر ہی پلتا بڑھتا رہا اور پھر بچپن کی تمام شرارتوں کو خندہ پیشانی سے جھیلنے والی ماں تو اس عمر میں بھی اس کی ضدوں کو شوق سے برداشت کرتی رہی تھی۔

گرمی کی تپش، سردی کی لہر اور بارش کے چھینٹے .... وہ کن کن چیزوں سے محفوظ نہیں رکھتی تھی ...... اسے وہ دن بھی یاد ہے جب اس کے پاپا کی اچانک موت ہو گی تھی اور پھر ہفتوں گھر میں چولھا نہیں جلا تھا دو ایک روز تو پاس پڑوس سے خوب خوب کھانا ملتا رہا۔ پھر جب یہ سلسلہ بند ہو گیا تو بھوک کی شدت پر بلکتے سسکتے بچے کیلئے وہ ماں ہی تھی۔ ادھر جو اُدھر سے دو وقت کی روٹی مہیا کرتی۔ خود نصف پیٹ کھاتی مگر اس کو پیٹ بھر کر کھلا کر ہی مسرور ہوتی۔

آج وہی ماں اسے تن تنہا چھوڑ کر دور، بہت دور چلی گئی تھی۔

وہ خود کو ماں کی شفقتوں اور عنایتوں کا ثمرہ سمجھتا تھا۔ شاید اس لئے وہ اس کی مرضی کو فوقیت دیتا اس کی رضا مندی کو خدا کی رضا مندی سمجھتا، اس کے حکم کو بجالانا اپنا فرض جانتا۔

ماں نے جہاں رشتہ طے کر دیا وہیں شادی کر لی۔ حکم ہوتا...... ابھی بہو کو میکے نہیں بھیجنا ہے نہیں بھیجتا۔ بچہ سرکاری اسکول میں نہیں، پرائیوٹ اسکول میں پڑھے گا۔ اس نے اس کی تعمیل کی ماں دن کو اگر رات کہتی تو وہ بھی رات ہی سمجھتا۔

وہ ماں کو بہر صورت خوش رکھنا چاہتا تھا اس کی خوشنودی کو وہ افضلیت دیتا۔ لیکن آج معلوم نہیں اسے کیا ہو گیا تھا کہ اس معمولی سی تصویر کیلئے ماں سے الجھ بیٹھا۔ گھر کی صفائی کرتے ہوئے ایک بوسیدہ گٹھری میں موجود ایک لفافے سے پرانی تصویر ہاتھ لگ گئی تھی اور پھر وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا کہ اس تصویر میں اس کی ماں ایک نو عمر اجنبی مرد کیساتھ تھی ایک کھٹک، ایک چبھن، کچھ اندیشے سر اٹھانے لگے۔

''یہ کون ہے ماں؟'' اس نے جاننا چاہا۔

''ارے یہ بہت پرانی تصویر ہے'' تمہیں کہاں سے مل گئی، ماں نے تصویر کو ہاتھ سے چھینتے ہوئے

کہا۔ایک خوابیدہ تمنا اچانک پورے جسم کو مسحور کر گئی۔

''تصویر تو بہت پرانی ہے مگر ہے کس کی؟'' اس نے مزید وضاحت چاہی، نوکیلی کیل اسے ستارہی تھی۔

''تم جان کر کیا کروگے، بات آئی گئی، ختم ہوگئی'' ماں اِدھر اُدھر بتا کر بات ختم کرنا چاہتی تھی۔ ماضی کے اندھیرے اسے ڈرارہے تھے۔

''پھر بھی یہ اجنبی سوٹ بوٹ والا شخص آپ کے ساتھ ہے کون؟'' اس کے تیور میں تیزابی کیفیت ابھر آئی۔ماں مجبور ہوگئی کہ اس میں اپنے لختِ جگر کا مغموم چہرہ لمحہ بھر بھی دیکھنے کی سکت نہ تھی اور پھر جوان بیٹے کے اس تیکھے تیور کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

''یہ تیرے باپ کی تصویر ہے'' ماں نے صاف صاف بتادیا۔لمحہ جاں گسل تھا لیکن قابل برداشت۔

''تو پھر وہ گورکن، جو مجھے کاندھے پر سارا سارا دن گھماتا تھا، انگلی پکڑ کر جس نے چلنا سکھایا، مدرسے کا منہ دکھایا اور یہ پیشہ جو وراثت میں دے گیا.......... وہ کون تھا؟''

''ہاں یہ بھی سچ ہے کہ تمہیں باپ کا نام اسی کمزور و نحیف گورکن نے ہی دیا تھا۔

وہ سکتے میں آگیا.......... وہ اپنے آپ کو اندر سے ٹوٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ابتک وہ جس گورکن کو اپنا باپ سمجھ رہا تھا وہ اس کا بیٹا نہیں تھا اس کا اصل باپ وہ سوٹ بوٹ والا صاحب ہے۔

''ماں یہ بات تم نے ابتک مجھ سے چھپائی کیوں'' اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوئی جارہی تھیں ماں خاموش بت بنی کھڑی اپنے بیٹے کے اندر کے جوالے کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں اس سوٹ بوٹ والے باپ کو ڈھونڈ نکالونگا۔کہاں کا لاٹ ہے یہ، کچھ اتا پتا تو ہوگا اس کا'' اس نے ماں کی خاموشی پر کاری ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹے، اس کی تلاش اب فضول ہے'' ماں نے بات کو دفن کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں ماں، اس کمینے کو قبر سے بھی کھود کر نکال لاؤنگا۔''

''نہیں بیٹے، ایسا نہیں کہتے............ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تیرے نانا ہی اس شادی کیلئے تیار نہ تھے'' ماں آنسو کے گھونٹ پیتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

'' کیوں؟'' لڑکے کے چہرے پر سوالیہ نشان ابھر آیا۔

'' بیٹے............ وہ ہمارے ہم زبان نہ تھے'' ماں نے مختصراً جواب دیا۔

'' یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ شادی میں زبان کا کیا دخل'' لڑکے نے وضاحت طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔

'' دراصل یہ ایک حادثہ تھا'' ماں ذرا مبہم انداز میں بولی۔

'' کیسا حادثہ؟'' لڑکے نے تفصیل طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔

'' یہ ۱۹۷۱ کی بات ہے سرحد کے اس پار زبان کے نام پر کہرام مچا ہوا تھا۔ دو زبانوں کی مشترکہ تہذیب والا دیس، زبان کی پستی و بلندی کے امتیاز پر ایک دوسرے کو مارنے کاٹنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کی شناخت تک مٹا دینا چاہتے تھے اور آخر ایک دن ایک کی جیت ہوئی اور دوسرے کو ہار کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس طرح ہزاروں لاکھوں کی لاش پر ایک نئے دیس کا وجود عمل میں آیا جسے ایک الگ زبان والا دیس قرار دیا گیا۔

تمہارے نانا سرحد کے اس پار ہوئی خونریز جنگ سے بُری طرح ٹوٹ گئے تھے جیسے بارود کی دھماکے ان کے جسم و جان پر ہی ہوئے ہوں۔ اس درمیان وہ بہت اداس اداس سے رہتے کیوں کہ ان کے خاندان کا ایک ایک فرد جو وہاں قیام پذیر تھا تباہ و برباد ہو گیا تھا درندوں نے ان کے خاندان کو بالکل تہ و تیغ کر ڈالا تھا۔

ٹھیک اسی درمیان میں نے اپنی شادی کی بات چھیڑ دی۔ تمہارے نانا کی رضامندی کے بغیر میں کوئی قدم کیسے اُٹھا سکتی تھی۔ بس تمہارے نانا بھڑک اٹھے اور پھر میرے ساتھ ان کو بھی اتنا ذلیل و خوار کیا کہ بس اللہ کی پناہ!

وہ خاموش بت بنے سب کچھ سنتے رہے اور جب صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا تو وہ بھی اپنی قوت

برداشت کھو بیٹھے۔تو تو، میں میں سے تکرار کی صورت ابھر آئی اور دھیرے دھیرے بہت سارے لوگ جمع ہو گئے..........

میں سہم گئی...... کہ ایک طرف وہ تنہا تھے، تو دوسری جانب اتنے سارے لوگ...... دل کی کیفیت ناگفتہ بہہ ہو گئی۔

میں بے چین ہو کر درمیاں میں آ کھڑی ہوئی۔ کبھی تمہارے نانا کو سمجھاتی تو کبھی ان کو کہتی .... آخر میں تمہارے پاپا کو اپنی قسم اور اپنی محبت کا واسطہ دیکر خاموش کیا اور وہاں سے ان کو رخصت کیا...... ورنہ ممکن تھا کہ سرحد کے اس پار کے خونی چھینٹے سرحد کے اس پار بھی دکھائی دے جاتے، میری پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔خون و دہشت کے خوفناک اندھیرے میں میرا مستقبل ڈوبتا جا رہا تھا۔

تمہارے نانا کو میں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے، اس وقت تم میری کوکھ میں پل رہے تھے میں نے تمہارا واسطہ دیکر نانا سے منت ساجت کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔میری ایک نہ سنی۔"

"یہ شادی ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی" نانا کی بس ایک ہی رٹ تھی۔

"کیوں پاپا کیوں؟" میں تمہارے نانا کے آگے گڑگڑائی۔

تب وہ گویا ہوئے..........

"اس لئے کہ اس کی زبان والے سرحد کے اس پار ایک معمولی سی زبان کی خاطر میرے پورے خاندان کو نیست و نابود کر ڈالا۔"

"اس میں پاپا ان کا کیا قصور؟" میں نے ڈوبتے لہجے میں احتجاج کیا۔

"وہ ہے تو اسی حسب نسب کا" پاپا کی آواز میں سختی ہی نہیں سنگ دلی بھی تھی۔

"اور پھر میری لاکھ التجا کے باوجود تمہارے نانا نے میری شادی اس گورکن سے کر دی۔ انہوں نے اس گورکن کو اس بات کیلئے رضامند کر لیا تھا کہ وہ تمہاری ذمہ داری بھی قبول کرے گا عوض

میں کچھ روپے پیسے بھی دیئے گئے' ' ماں کی آواز میں ان دیکھے زخموں کا کرب جھانک رہا تھا۔
'' یہاں میں اجنبی چہروں کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئی۔ میلوں میل چکنے سپاٹ چہرے میں اجنبی وغیر مانوس چہروں کے درمیاں الجھ کر رہ گئی تھی کہ تمہارے گورکن بابا کی صورت پر فرط وانبساط کی چند پھوٹتی کرنوں کو دیکھکر مجھے دھارس بندھی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ غربت سے مرجھائے ہوئے کمزور چہرے پر بھی اعتماد کی بھرپور چمک قائم تھی۔ کمزور ہڈیوں والے چہرے پر شفقت اور ہمدردی کا ایک اُمڈتا ہوا سیلاب موجزن تھا۔ واقعی تمہارے بابا شفقت اور ہمدردی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہی نکلے.........''
ماں کی آواز میں تھکن اور مایوسی کا کرب نمایاں تھا۔
'' وہ نہ صرف میرے ساتھ نہایت رحم دلی سے پیش آتے بلکہ تمہیں بھی ٹوٹ کر چاہتے۔ وہ ہمیشہ تمہیں اپنے جسم کا ہی ایک حصہ تصور کرتے، انہوں نے تمہاری پرورش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ سارا سارا دن وہ تمہیں اپنے کاندھے پر اُٹھائے پھرتے۔ اِدھر اُدھر جہاں بھی جاتے تمہیں ساتھ رکھتے مجھ سے زیادہ انھیں تمہاری فکر رہتی کیا کھائے گا، کیا پیئے گا، تمہاری تمام ضرورتوں پر ان کی نگاہ رہتی۔
لیکن آج تم پر اپنے باپ کی تلاش کا جوش اتنا ابھر آیا کہ اس کمزور باپ کی بے لوث شفقتوں کو ایک گھروندے کی طرح منٹوں میں ڈھا دیا اور میری ممتا کی بھی پرواہ نہ کی...... جو دھوپ تو دھوپ، بارش کی ٹھنڈی بوندوں سے بھی تمہیں ہمیشہ محفوظ رکھتی تھی لیکن میرے بیٹے، میری ممتا میں کہیں کھوٹ رہ گئی تھی کہ آج میرے ذہن کے دریچوں میں محفوظ ان یادوں کی قبر کو بھی تم نے کھود ڈالا جسے میں شاید مرتے دم تک اپنے دل کے نہاں خانے میں مدفون رکھنا چاہتی تھی......''
یہ کہتے کہتے ماں فرش پر لڑھک گئی.........
وہ ماں کی قبر کھود رہا تھا اور آنکھیں آنسو رول رہی تھیں

◆◆◆

آدم کی نئی نسل

آدم کی نئی نسل

بچے کے رونے کی آواز سن کر سبھی لوگ جمع ہو گئے تھے اس ویران و سنسان گھر سے آج کئی روز سے کسی بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ مدتوں سے ویران پڑے اس گھر سے کسی نومولود بچے کی آواز پر سبھی حیرت زدہ تھے۔ گھر دو کمروں پر مشتمل تھا جو مدتوں سے بند پڑا تھا۔ لوگ اسے بھوت بنگلہ تصور کرتے تھے جنگلی پودے دروازے کے ارد گرد اُگ آئے تھے۔ کمرے کی کارنیس پر بھی کچھ پودے نکل آئے تھے۔ مکان کی زبوں حالی کیوجہ سے بھی لوگ اس طرف نہیں جاتے تھے کہ کب اور کس لمحے خستہ درو دیوار گر پڑے اور بھوت کی موجوگی کا خوف بھی لاحق رہتا۔

لیکن آج اس خاموش درو دیوار میں جیسے زبان نکل آئی ہو جس کی پکار پر علاقے کے بڑے چھوٹے، جوان، بوڑھے، کمزور و تندرست سبھی جمع ہو گئے تھے۔ کل تک جس بھوت بنگلہ سے لوگ ڈرتے تھے آج اس گھر کے چاروں طرف گاؤں کے لوگوں کا ہجوم تھا مکھیا نے حالات کی نزاکت کے مدنظر کوتوالی سے سرکاری حکام کو بھی بلوالیا تھا۔ سرکاری حاکم کے حکم پر دروازے پر لگے زنگ آلود تالے کے پہلے کھولنے کی کوشش کی گئی پھر مجبوراً تالا توڑنے کا حکم دیا گیا۔

بڑی مشکل سے جب دروازہ ذرا وا ہوا تو ایک بو تیزی سے باہر کی جانب لپکی اور ساری فضا میں پھیل گئی۔ لوگوں کی ناک اور بھوئیں سکڑ گئیں۔ ہر کوئی منہ پر کپڑا لپیٹے یا رومال رکھے حالات اور بو کی کیفیت لینے کیلئے بے قرار تھا، بو پوری قوت کیساتھ اپنی نتھنوں میں سرایت کررہی تھی۔ لوگ گھبرائے سہمے، خوف زدہ ہو کر دور ہٹنے لگے۔ نوزائید بچے کے رونے کی آواز اب بند ہوچکی تھی کمرہ بالکل تاریک تھا۔ ہر سو اندھیرا۔ گھنگور اندھیرا۔ صرف مکھیوں اور کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی رتھی۔

سرکاری عملے منہ پر کپڑا لپیٹے، تنگ و تاریک کمرے میں ٹارچ کی دھیمی روشنی لیکر اتر آئے، ٹارچ کی دھیمی روشنی میں ناپ تول کر قدم اٹھاتے ہوئے عملے کے نوجوانون ابھی دو ہی قدم چل پائے تھے کہ وہ چیخ اٹھے باہر موجود لوگ بھی چیخ سن کر ہواس باختہ ہوگئے۔ حیران اور متلاشی نگاہوں سے دروازے کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگے، شاید کوئی انہونی دیکھنے کو ملے۔ عملے کے نوجوان بوکھلا کر باہر نکل آئے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت تھی......اوران کے منہ کھلے کے کھلے! وہ گنگ زبان ہوئے، صرف اشاروں اور کنایوں میں ہی اپنی کیفیت کا اظہار کر پا رہے تھے۔

سرکاری حاکم نے اپنے نوجوانوں کو پہلے تسلی دی، ہمت بندھائی اور پھر یوں گویا ہوئے......

''گھبرانے کی ضرورت نہیں..........صاف صاف کہو کیا بات ہے۔''

''سر! اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور کمرے میں اتنی بو پھیلی ہے کہ ایک منٹ بھی وہاں ٹھہرنا ممکن نہیں اور پھر اندر مکھیوں مچھروں اور کیڑوں کی بہتات ہے جس میں سانس لینا بھی مشکل ہے'' عملے کے سربراہ نے کہا۔

''اندر بچہ ہے؟'' حاکم نے دریافت کیا۔

''جی، ہاں! ایک نومولود بچہ ایک مکروہ نیم برہنہ سی عورت کے سینے سے لپٹا ہوا ہے'' عملے کے ایک فرد نے کہا۔

''اور کچھ؟'' حاکم نے مزید جانکاری چاہی۔

''جی، ہاں...... خوفناک مکروہ صورت مرد بھی ہیں'' عملے میں سے ایک نے کہا۔

سرکاری حاکم کے دوبارہ حکم پر ایک بار پھر عملہ کے نوجوان، اپنی قوت کو سمیٹ کر کمرے میں داخل ہوئے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک نہایت ہی وحشی صورت والے انسانی ڈھانچے کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر نکال لائے۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی سبھوں نے کراہیت سے آنکھیں پھیر لیں۔ داڑھی، ناخن اور بال شاید کبھی ترشوائے نہیں گئے تھے۔ چہرے پر مکھیوں اور مچھروں کی بھنبھناہٹ ہو رہی تھی۔ سارا جسم گرد اور میل سے اٹا ہوا تھا اور جسم پر کپڑے تقریباً نا کے برابر تھے۔

دوسرے ہی لمحے دو نوجوان دوسری نیم مردہ لاش کو باہر نکال لائے۔ اس کی بھی کیفیت کم و بیش ویسی ہی تھی اور اب تیسری کی باری تھی۔ لیکن عملہ کے نوجوان تقریباً نڈھال ہو گئے تھے۔ اندر کی بو اور مچھروں، مکھیوں کی یورش سے انھیں ابکائیاں آ رہی تھیں۔

''ایک بار اور کوشش کرو اور اس بچے کو باہر نکالو'' حکم جاری ہوا۔

''سر! اس عورت کے جسم پر کپڑے ان لوگوں سے بھی زیادہ پھٹے ہیں بس یوں سمجھئے کہ قریب قریب برہنہ ہے اس صورت میں باہر لانا مناسب نہیں'' عملے کے ایک نوجوان نے کہا۔

گاؤں کے مکھیا نے اپنے کاندھے پر کے انگوچھے کو اتار کر اس کی اور بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے اس میں لپیٹ کر لے آؤ۔''

''وہ زندہ ہے نا؟'' مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

''کہا نہیں جا سکتا...... لیکن بچے میں حرکت ہے'' عملے کے سربراہ نے بتایا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ لوگ نیم مردہ سی عورت کو اس کے بچے کیساتھ باہر نکال لائے۔ باہر لوگوں کی آنکھیں یہ منظر دیکھکر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عورت کے اندر کی نسوانیت پر حالات کا پرت کچھ اس طرح جم گیا تھا کہ سبھوں کی نظریں سمٹ کر ان کی اپنی ہی آنکھوں کے

حلقے میں لوٹ آئیں۔

سرکاری حاکم سے عملے کے نوجوان نے ان دونوں کو پہلے غسل کرایا۔ پھر ان کے ناخن اور بال ترشوائے گئے اور قرینے سے آدمی کے حلیے میں لایا گیا۔ عورت کو زنانہ وارڈ کے وارڈن کے حوالے کردیا گیا جہاں اسے سلیقے سے انسان کے مہذب حلیئے میں اتارا گیا۔

اور جب سجا سنوار کران لوگوں کو باہر نکالا گیا تو سورج کی تیز روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں ایسا گماں ہوا کہ جیسے سورج کی روشنی سے پہلی بار ان کی آنکھیں چار ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی آنکھیں موندلیں۔ وہ حالات سے آنکھیں ملانے کو تیار نہ تھے۔ اشاروں سے ہی سورج کی تیز روشنی کو ہٹانے کو کہہ رہے تھے تب انھیں کمرے کے اندر لے جایا گیا جہاں ان لوگوں نے خود کو محفوظ پایا اور کچھ عافیت سی محسوس کی۔

لیکن اب بھی وہ لوگ کچھ بول نہیں رہے تھے سہمے سہمے، خاموش، بکے بکے، متلاشی نگاہوں سے ادھر اُدھر کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ بس خاموش تماشائی بنے کمرے میں موجود لوگوں کو ننگی آنکھوں سے نہار رہے تھے بے روغن چہرے، بڑی مگر اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، جسم گوشت پوست سے الگ ڈھانچہ نما، تینوں سرکاری کرسیوں پر جھولتے ہوئے معلوم ہورہے تھے۔

رپورٹر اپنے اخبار کیلئے گرما گرم خبروں کی سرخیاں چاہ رہے تھے فوٹو گرافرس انھیں انسان نما جانور تصور کرکے ان کی تصویریں اتار رہے تھے۔ غسل سے قبل، دروازہ توڑنے کے عمل سے لیکر باہر نکالے جانے تک ان وحشی اور نیم برہنہ صورتوں کی کئی تصویریں اتار چکے تھے پھر بھی ان کے کیمرے کی بھوک نہیں مٹی تھی۔

باہر پولس کی مداخلت سے ہجوم پر کنٹرول رکھا جارہا تھا اور اندر ان لوگوں کے بیان لئے جا رہے تھے۔

''ایک مدت سے یہ مکان مخدوش پڑا تھا'' گاؤں کے ایک ضعیف شخص نے کہا۔

''آزادی کے بعد یہاں کسی کو دیکھا نہیں گیا'' مکھیا نے جملے کو آگے بڑھایا۔

''ہاں...... ! یہ سب درست ہے'' نخیف و کمزور بابا نے تصدیق کی اور مزید کہا۔

''اس گھر میں کبھی دو بھائی ایک ساتھ رہتے تھے بڑا بھائی میرے ساتھ کرانتی کاری دل میں شامل تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے''

ذہن پر زور دیتے ہوئے بوڑھے بابا نے کہا......۔

''بڑے بھائی کو انگریز، پانڈے کانڈ، میں گرفتار کر کے لے گئے تھے اور شاید پھر اسے گولی ماردی گئی تھی جس سے سارے گاؤں میں دہشت پھیل گئی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا دبکے تھے میں اور میرے کئی کرانتی کاری ساتھی، کئی روز تک باہر نہیں نکلے۔ جب ذرا ماحول ٹھنڈا ہوا تو میں اس کے چھوٹے بھائی سے حال لینے اس کے گھر پہونچا۔'' بابا تھوڑی دیر کیلئے رُکے اور پھر کہنا شروع کیا۔

''اس وقت اس کا چھوٹا بھائی بالکل خاموش، خاموش سا تھا۔ گم صم، اپنے بھائی کی موت پر سوگ منا رہا تھا۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بس آنکھوں کے اشارے سے اپنی کیفیت بیان کر گیا۔

اسکا بھائی کرانتی کاری تھا۔ اس نے جنگ آزادی کے لئے شادی نہیں کی تھی لیکن چھوٹے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے سے خاندان کو اب سمیٹ کر رکھنا چاہتا تھا۔ گاؤں میں اب وہ کسی سے ملتا جلتا بھی نہیں تھا بس اپنی کھیتی باڑی میں مگن رہتا۔ اپنے اس چھوٹے سے گھر کی چہار دیواری میں ست رہتا۔ باہر کے ماحول سے بالکل خوف زدہ ہو کر رہ گیا تھا شاید اسی لئے اس چھوٹے سے گھر کے آنگن کو بھی چھت سے ڈھانپ رکھا تھا...... باہر کی آلودگی سے اسے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ باہر کی زہر آلود فضا سے خود بھی بچتا اور بچوں کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا''۔

اس بار بابا کافی دیر کے لئے خاموش ہو گئے جیسے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر

رہے ہوں۔

''اور جب انگریز ہندوستان چھوڑ کر جانے لگے تو اپنے پیچھے بم کے دھماکے چھوڑ گئے اس میں یہ گاؤں بُری طرح جھلس کر رہ گیا، گاؤں کی ایکتا کھنڈ کھنڈ ہو کر رہ گئی۔ بھائی چارگی کی دبیز چادر تار تار ہو کر رہ گئی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو اپنا دشمن تصور کرنے لگا۔ اس طرح اس روز ہنگامہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا اور اس گھر پر بھی کچھ حملہ آوروں نے ہلہ بول دیا تھا۔ اتفاق سے دہشت گردوں کو صرف گھر کی مالکن ہی ہاتھ لگی ورنہ ہم لوگوں نے تو کچھ اور ہی سمجھ لیا تھا...... تینوں بچے شاید اپنے بند کمرے میں ہی گہری نیند سو رہے تھے اور مالکن اپنے شوہر کے انتظار میں دروازے پر ہی کھڑی منتظر تھی کہ بلوائیوں نے آ دبوچا اور اسے اٹھا کر لے گئے۔

اس کی خبر پاتے ہی وہ دوڑا آیا لیکن پہلے اس نے اپنے بچوں کی خبر لی۔ گھر کے اندر گیا۔ جہاں بچوں کو محفوظ پا کر باہر سے دروازے پر تالے ڈال دیا اور مجھ سے یہ کہہ کر کہ اس کی بیوی کی زندگی خطرے میں ہے وہ بلوائیوں کے پیچھے بھاگا۔ میں بھی تھوڑی دیر اور نکلا مگر دروازے پر تالے دیکھ کر مایوس لوٹ گیا اور وہ جو بلوائیوں کے پیچھے گیا تو آج تک نہیں لوٹا۔

تینوں بچے اسی کمرے میں بند رہ گئے۔ ویسے بھی باہر کے ماحول سے ان لوگوں کو دلچسپی تھی بھی کہاں!''

مکھیا کے بابا کی سانسیں اکھڑ گئی تھیں...... وہ کھانسنے لگے۔

''اس بات کی رپورٹ کسی نے پولس میں لکھوائی تھی؟'' حاکم نے دریافت کی۔

''گاؤں کے سارے لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ سبھی مارے گئے ہیں'' مکھیا نے بابا کی سانس اکھڑتے ہوئے دیکھ کر خود آگے بڑھ کر کہا۔

''اس وقت سے اس گھر کو بھوت بنگلہ سمجھ کر بچے بھی اِدھر نہیں نکلتے تھے اور پھر یہ گاؤں کی سرحد کے بالکل آخری سرے پر واقع تھا''

اس طرح تینوں بھائی بہن اس تنگ و تاریک کمرے میں شاید کیڑے مکوڑے، چوہے بلی کھا کھا کر اپنی بھوک مٹا رہے تھے۔ دنیا و مافیہا سے دور، حالات اور وقت کی نزاکتوں سے بے خبر، چیخ و پکار سے پرے، خاموش اور تاریک کمرے میں جی رہے تھے ے جہاں پیٹ کی بھوک پر کب جسم کی بھوک غالب آ گئی۔ یہ کہنا مشکل تھا۔ لیکن ایک فرشتے کی آمد نے دنیا کو باخبر کر دیا کہ اکیسویں صدی کی آمد سے قبل ہی اس تاریک گوشے میں آدم کی نئی نس ل کا وجود عمل میں آ چکا تھا۔

آسودگی

آسودگی

مکھیا صبح سے ہی پریشان تھا
یوں تو مکھیا کی اکلوتی بہو رات سے ہی کراہ رہی تھی لیکن مکھیا کو اس کا علم صبح صادق، جب اس کی نیند ٹوٹی تو ہوا۔ اس وقت سے وہ ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا بیٹے کا اترا ہوا اداس چہرہ دیکھکر مکھیا اور بھی نڈھال ہو جاتا۔
اندر بہو درد سے کراہ رہی تھی کہ اب اس کی چیخیں برآمدے میں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ مکھیا کی عورت اور گھر کی دوسری عورتیں بہو کو ڈھارس بندھا رہی تھیں۔
باہر مکھیا کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا کہ اکلوتی بہو اسے بیٹی کی طرح عزیز تھی اس کی پریشانی اور درد کے احساس سے مکھیا کا بے چین ہونا لازمی تھا اور پھر اسکے ونس کا بھی سوال تھا اگر بہو کو کچھ ہو گیا تو اس کا گھر ویران ہو جائے گا اسے زچہ اور بچہ دونوں کی سلامتی چاہیئے تھی۔ کہ بہو کی اچھی صورت اور نیک سیرت اس کو بھلی لگتی تھی اور پھر بہو کے میکے میں اس کا اپنا سگا سمبندھی تھا بھی نہیں، ماں تو بیٹی کی شادی سے قبل ہی سوگ سدھار گئی تھی اور باپ گذشتہ دنوں طویل علالت کے بعد پرلوک سدھار گئے تھے۔ بہو کی ساری ذمہ داری اب مکھیا کی تھی اور پھر بیٹے کی پسند اور خوشی کا سوال تھا وہ جانتا تھا کہ بہو کی تکلیف پر اس کا اپنا بیٹا کتنا درد محسوس کر

رہا ہوگا۔

مکھیا کی گھر والی وقفے وقفے سے باہر آتی اور مکھیا کو ڈھارس بندھاتی..........

''بس، اب فاطمہ آتی ہی ہوگی''

''بہو کو شہر کے اسپتال لے چلتے ہیں'' مکھیا بے چین ہوکر کہتا۔

''نہیں، فاطمہ کو آنے دیجئے، سب ٹھیک ہو جائے گا'' گھر والی تسلی دیتی۔

''پہلے بچے کے جنم پر احتیاط لازمی ہے'' مکھیا گھر والی کو سمجھاتا۔

''ہاں ٹھیک ہے، گھبرانے سے تھوڑے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، فاطمہ کو آنے بھی دیجئے۔ وہ جیسا کہے گی ہم کریں گے'' گھر والی سمجھاتی۔

''فاطمہ پر تو مجھے بھی بھروسہ ہے'' مکھیا نے دل کو ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھا نہیں تھا...... نرائن بہو کو جب شہر کے بڑے ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد سرکاری اسپتال میں پھینک دیا تھا تو وہاں نہ نرس تھی نہ ڈاکٹر...... وہ فاطمہ ہی تو تھی جو اتنی نرمی سے بچہ کو'' مکھیا کی گھر والی تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔

فاطمہ کی نیک صورت اور اعلیٰ کردار سے مکھیا اچھی طرح واقف تھا فاطمہ تو بس خدمت خلق کے لئے ہی جی رہی تھی فاطمہ شفقت کی پوٹلی تھی بلا تفریق سبھوں پر یکساں شفقت نچھاور کرتی تھی۔

فاطمہ عورتوں کے لئے مسیحا سمجھی جاتی تھی۔ عورتیں بھی اسے اپنے دکھ درد کی مداوا سمجھتیں۔ گاؤں کی عورتیں بے جھجک اسے اپنی بپتا سناتیں اور فاطمہ توڑ موڑ کر ان کے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال دیتی۔ عورتیں خوش ہوتیں۔ بڑی دعائیں دیتیں اور چھوٹی بالیاں بس پیار سے مسکرا کر رہ جاتیں۔

زچگی کی صورت میں پریشان عورتوں کیلئے تو فاطمہ سچ مچ مسیحا تھی۔ اس کا ہاتھ لگا اور تکلیف دور!

فاطمہ بھی جہاں خبر ملی کہ فلاں کی بہو بیٹی زچگی میں ہے اور درد کے اتار چڑھاؤ سے پریشان ہے وہ فوراً آ دھمکتی۔ خوب خوب خدمت کرتی اور اپنے رب سے اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگتی اور جب تک بچہ اور زچہ کو صحت یاب نہیں دیکھ لیتی وہاں سے نہیں ٹلتی۔

''لیکن فاطمہ ابتک آئی کیوں نہیں؟'' مکھیا نے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے پوچھا

''کل رات انصار میاں کی چھوٹی لڑکی نے ایک بچی کو جنم دیا ہے'' مکھیا کی گھر والی نے داستان زچگی سناتے ہوئے کہا۔

''بچہ تو ٹھیک ہے لیکن زچہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی اسی میں وہ پریشان ہوگی''

اِدھر مکھیا کی بہو کی چیخیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ بہو کی حالت غیر سے مکھیا پریشان ہو اٹھا۔ بیٹا بھی کبھی ماں سے کیفیت لیتا تو کبھی باپ کو جواب طلب نگاہوں سے ٹٹولتا۔ چہرے کا روغن اترتا جا رہا تھا۔ مکھیا بیٹے کے چہرے کو خوب خوب پڑھ سکتا تھا ایک خوف اس کے چہرے پر بھی پھیل گیا۔

''کیا وارث کی چاہ ہی زندگی ہے''

''زندگی اس سے ہٹ کر بھی تو ہے''

بہو اور بچہ کے درمیان مکھیا کے سامنے ایک اور صورت ابھرائی۔

فاطمہ!

پیار کا ساگر فاطمہ،

فاطمہ کے دل کی اتھاہ گہرائی میں خاموشی ہی خاموشی

ایک گہری سوچ،

سوچ کا گہرا سمندر

اور اس سمندر میں مدو جزر کا ایک لامتناہی سلسلہ ....

سامنے فاطمہ کھڑی تھی!

''مکھیاجی! اوپر والے پر بھروسہ رکھئے، سب ٹھیک ہو جائے گا'' فاطمہ نے آتے ہی مکھیا کو تسلی دی۔
مکھیا کے چہرے کا روغن اتر چکا تھا پاس کھڑی اس کی گھر والی اسے ہمت بندھا رہی تھی۔
''فاطمہ آ گئی ہے اب فکر کی ضرورت نہیں اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔ بس دیکھئے چند منٹوں میں ہی بہو کی تکلیف کیسے دور ہو جاتی ہے۔''
ذرا گرم پانی دیجئے اور ہاں ایک نیا بلیڈ بھی منگوا لیجئے'' فاطمہ نے مکھیا کی گھر والی کو ہدایت کی اور اپنے کام میں کمر کس کر جٹ گئی۔
سرسوں تیل کی ملیا لئے وہ کمرے میں آئی اور بہو کر تسلی دیتے ہوئے بولی۔
''اپنے بھگوان پر بھروسہ رکھو بہو، وہی سب کا مالک ہے اور پھر تجھے ہوا ہی کیا ہے جو اس قدر چیخ رہی ہے یہ تو ہم عورتوں کیلئے فخر کی بات ہے، ہے کوئی مرد کا بچہ جو اذیتیں خندہ پیشانی سے جھیل لے''

فاطمہ کے تسلی بھرے بول سے مکھیا کی بہو کو بڑی خوشی ملی اور پھر فخر سے اس کا چہرہ دمک اُٹھا۔
فاطمہ اس کے پاؤں پر مالش کرتے ہوئے بولی......
''لے اپنے پاؤں موڑ......اور سانسیں زور زور سے لے''
''مکھیا بھوجی! تکیہ تو ذرا کمر کے نیچے ڈالئے'' فاطمہ نے ہدایت کی۔

فاطمہ اسی گاؤں میں جنمی۔ پلی، بڑھی اور جوان ہوئی تھی اور آج اس صورت جی رہی تھی کھاتے پیتے گھرانے کی خوب سیرت لڑکی جب جوان ہوئی تو اس کے ابا نے بڑے دھوم دھام سے اس کی شادی رچائی۔ لڑکا بھی خوب رو تھا۔ سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا۔ کافی اچھی آمدنی تھی۔ خوش حال لوگ تھے لیکن اسے بدقسمتی ہی کہئے...... چار پانچ سال تک جب کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس کی سسرال والے اس کو پریشان کرنے لگے طرح طرح سے اذیتیں دینے لگی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو مداخلت کرنی پڑی تب کہیں جا کر ان لوگوں کے سلوک میں تھوڑی بہت تبدیلی آئی اور اس کا علاج کروانے پر رضا مند ہوئے لیکن پھر بھی خاطر خواہ کوئی نتیجہ نہیں

نکل پایا تو وہ لوگ پھر گئے اور بات صلح صفائی تک آ پہنچی۔ گاؤں کے لوگوں نے علاحدگی میں ہی عافیت سمجھی کہ فاطمہ پر بانجھ ہونے کی تہمت پر موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کی سسرال والوں کو اپنے خاندان کے لئے وارث چاہئے تھا اس کے آگے سبھی خاموش تھے۔

فاطمہ اس ذلت کی زندگی کو چھوڑ کر گاؤں واپس چلی آئی لیکن اس طرح کی واپسی پر اس کی ماں ٹوٹ سی گئی۔ بچی کا اداس چہرہ دیکھکر اندر ہی اندر گھلنے لگی اور چند مہینوں میں ہی اپنے معبود حقیقی سے جا ملی۔

اِدھر فاطمہ کے ابو کی حالت بھی بگڑتی جا رہی تھی اکثر سوچتے کہ اگر میں بھی نہیں رہا تو فاطمہ کا کیا ہوگا۔ اسی درمیان فاطمہ کے لئے ایک رشتہ ہاتھ لگ گیا۔ لڑکے کا اپنا بزنس تھا اور پختہ مکان بھی، آرائش وزیبائش کے سبھی سامان میسر تھے کمی تھی تو ایک شیر خوار بچے کی پرورش کے لئے ممتا کی مورت کی، کہ کچھ ہی دن قبل اس کی شریک حیات ایک بچہ کو جنم دیکر اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئی تھی۔ بچے کی دیکھ ریکھ کیلئے ایک موہنی صورت کی تلاش تھی۔ لڑکے والے کی خواہش صرف یہی تھی کہ لڑکی ممتا کی صورت ہو اور اپنے اندر خود کوئی بچہ جننے کی خواہش نہ رکھتی ہو اس صورت میں فاطمہ کے بانجھ پن کی شہرت کام آ گئی۔

اس طرح ایک بار پھر فاطمہ کا گھر بس گیا۔ وہ خوش تھی بچہ کو اپنی زندگی تصور کرتی۔ دن رات بچے کو سینے سے چمٹائے رکھتی، وہ تو اپنی ممتا کی چھاتی چیر کر بچے کو اس میں سمائے رکھنا چاہتی تھی۔ خوب اچھے دن تھے قدرت کے اس عطیہ پر وہ نازاں تھی کہ جیسے کوئی انمول خزانہ مل گیا ہو۔

لیکن ایک دن وقت کی آندھی میں اس کا خزانہ دب کر رہ گیا۔ اچانک فاطمہ کا پاؤں بھاری ہو گیا اور پھر یہ بھاری پن اس کی سسرال والوں پر پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا۔ فاطمہ اندر ہی اندر قدرت کے اس فیصلے پر خوش تھی لیکن خاوند کے اس نئے تیور سے پریشان رہتی کہ انھیں فاطمہ کی یہ نئی صورت پسند نہ تھی۔

''یہ ممکن نہیں، میرے بچے کی جگہ کوئی دوسرا لے...... یہ ممکن نہیں، تمہیں اسقاط کرانا ہوگا۔''

''نہیں!'' فاطمہ چیخی...... ''آپ ایک عورت کی دلی کیفیت کو کیوں نہیں محسوس کرتے، ایک ایسی عورت جس پر بانجھ کا تیز وتند وار کیا گیا ہو۔ اس کے پیٹ میں ممتا کی کلبلاہٹ سے اس کے تن من کو کتنا سرور مل رہا ہوگا۔ کاش آپ عورت کی اس ہیجانی کیفیت کو پڑھ سکتے۔ ایک عورت جس کے عورت پن پر برسوں کاری ضرب لگائی گئی ہو آج اس کے اندر عورت کی وہ صورت عود کر آئی ہے جس کی عظمت کے آگے ولیوں کے سر بھی خم ہوئے ہیں۔''

لیکن اس کے خاوند نے اس کی ایک نہ سنی اور جلال میں آ کر اس کا ابورشن کروا دیا۔ اور پھر وہ پر کٹے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر فرش پر ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ ہفتوں وہ اسپتال میں پڑی اپنے غم و غصے کو دوا سمجھ کر حلق کے نیچے اتارتی رہی۔ شاید اس کا غم و غصہ جسم کے اندر زخم کی صورت اتر آیا تھا اسی لئے وہ اسپتال سے سیدھے اپنے گاؤں واپس چلی آئی اور جہاں آج سبھوں کی مسیحا بنی خود کو قسطوں میں بانٹ رہی تھی۔

فاطمہ مکھیا کی بہو کو بہر صورت بچانا چاہتی تھی اور اسے بہو سے زیادہ اس بچے کی فکر تھی جو کبھی اس کی بانجھ کوکھ میں بھی کلبلا چکا تھا۔ وہ کبھی بہو کے پھولے پیٹ پر کچھ قوت لگاتی تو کبھی اس کی ننگی ٹانگوں پر مالش کرتی۔ فاطمہ کیلئے عورتوں کی خدمت، عبادت کا درجہ رکھتی کہ اب یہی اس کا دین و ایمان تھا۔ وہ آج اس کیفیت سے خود کو نکال نہیں پا رہی تھی سسرال والوں کو اذیتیں بانجھ کی لعنت! اور پھر ابورشن؟ ویسے اس درمیان فاطمہ کے سسرال والے کئی بار آئے سمجھوتے، کی دبیز چادر پھیلائے، اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار کیا لیکن فاطمہ ان لوگوں کی ہر التجا پر اپنی نفرت کا ایسا نقطہ ابھارتی کہ سمجھوتے کی چادر تار تار ہو کر رہ جاتی۔

لیکن فاطمہ نہیں چاہتی تھی کہ مکھیا کی بہو کی چادر تار تار ہو۔ وہ اسے ہر صورت میں محفوظ رکھنا چاہتی تھی وہ مسلسل کوشش کر رہی تھی۔ مکھیا کی گھر والی بھی ساتھ لگی رہی اسے امید تھی کہ

فاطمہ کے ہاتھوں کا جادو اثر دکھا کر رہے گا۔

اور جب اعتماد کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے تو پردے کے پیچھے بھگوان بھی ڈولتا ہے۔ فاطمہ نے اللہ کا نام لیکر بہو کے دونوں کانوں میں کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھوں کو پھیرا، پھر بہو کی کمر سے نیچے اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے نیچے اترتی چلی آئی۔

اور بس پھر..................

مکھیا بھوجی نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔ اس کے ونس کا وارث زندہ جاوید فرش پر پڑا تھا۔ بہو نڈھال نیم جان ایک کونے میں پڑی تھی۔ آنکھوں میں نشے کی کیفیت طاری تھی، چہرہ فخر سے سرخ ہوا جا رہا تھا کہ اس نے بیٹا جنا تھا،

مکھیا کا چہرہ بھی خوشی سے پھیل گیا تھا۔ سامنے فاطمہ کھڑی مسکرا رہی تھی کہ خوشی سے مست مکھیا نے فاطمہ کے دونوں پاؤں چھو لئے۔

اس وقت فاطمہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مکھیا کی بہو نے نہیں اس نے بچہ جنا ہے اور اس کا نا ہنجار خاوند، اس کی عظمت کے آگے دوزانوں پڑا ہے۔

سفر ہم سفر
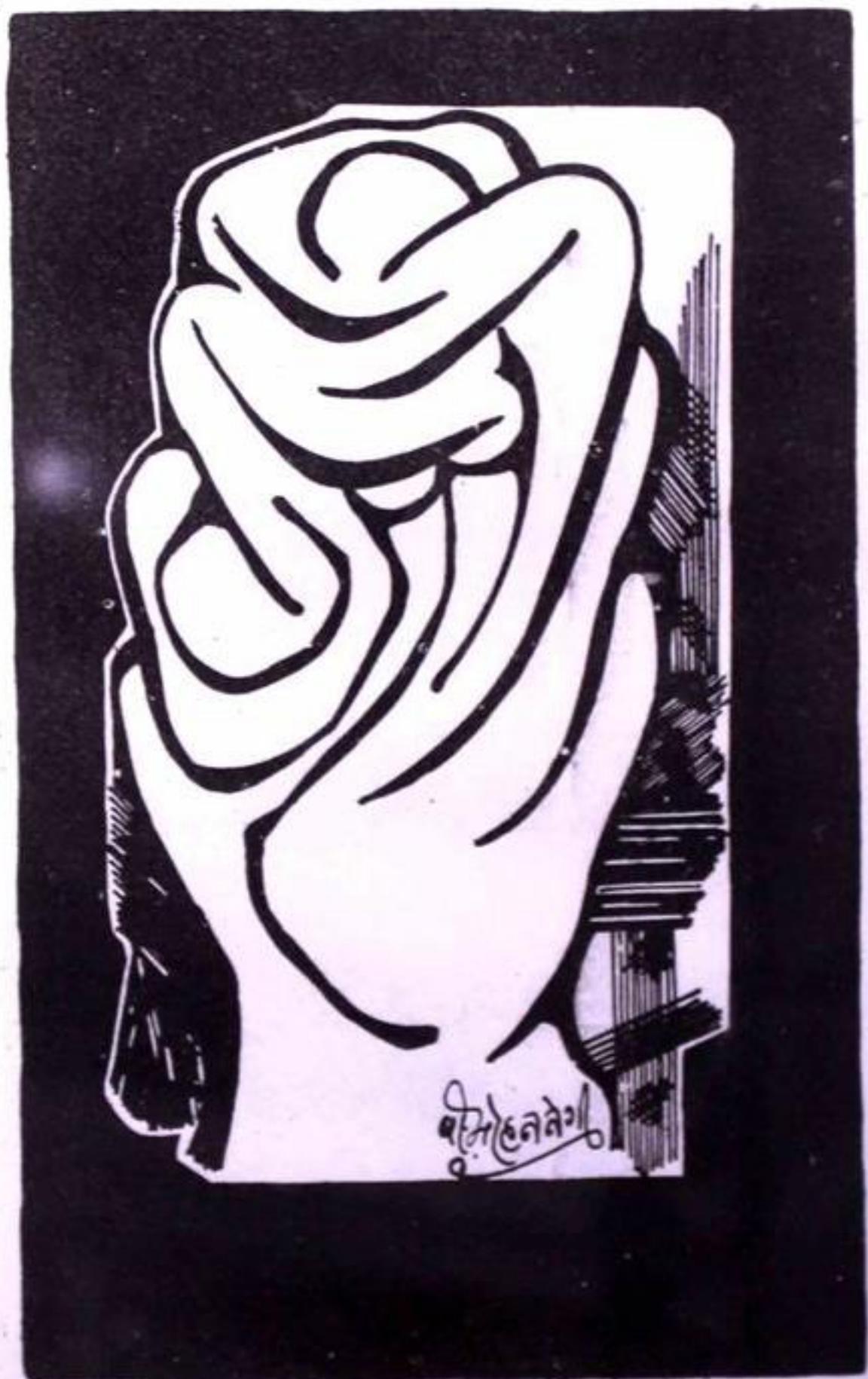
سفر ھم سفر

ابا جان!

آپ ناراض ہونگے اس کا مجھے احساس ہے لیکن یقین جانئے آپ کا حکم بجالانا ہی میری عبادت ہے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ اپنی ذمہ داری نباہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ آپ کو میری خوشی کا ذرا بھی پاس نہیں...... وہ لوگ بھلے برے ہوں ان کا کاروبار بھی مانا درست نہیں الم غم آمدنی کے غیر شرعی ذرائع ہیں لیکن ذرا غور کیجئے اس میں شارب کہاں ذمہ دار ٹھہرتا ہے؟ وہ تو صوم وصلواۃ کا پابند بھی ہے اس کی پرورش بھی ہوسٹل کے ماحول میں ہوئی ہے اور درس وتدریس کے مہذب پیشے سے منسلک ہے۔

للہ مجھ سے اپنی مرضی سے جینے کا حق تو نہ چھینئے۔ کاش آپ اپنی ضد چھوڑ دیتے اور میری خواہش پر توجہ دیتے۔ ویسے آپ کا حکم سر آنکھوں پر، یقین رکھئے آپ کی اجازت کے بغیر میں اپنا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی۔ اگر ماں ہوتیں تو یہ ساری باتیں اتنی تفصیل سے آپ کو کبھی نہیں لکھتی آپ کی اجازت اور دعاؤں کی محتاج،

— **شہرت انصار**

خط پڑھتے پڑھتے انصار علی کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے بیٹی کی دانشمندی پر تو انھیں ذرا برابر بھی شک نہ تھا تعلیم یافتہ بیٹی کے بلند اخلاق اور اس کی زندگی کے شعور کی آگہی سے وہ ناواقف نہیں تھے۔

لیکن شارب کے والدین کی صحبت انھیں گوارا نہ تھی کہ شارب کے جسم میں انھیں بدکرداروں کا خون دوڑ رہا تھا۔ ایسی مکروہ صورت والوں سے اچھی سیرت کی توقع فضول تھی۔

انصار علی نے شہرت کے خط کو کئی بار پڑھا مگر ہر بار ان کے ارادے کو نئی قوت ملتی گئی۔ ریزرویشن تو کئی روز قبل ہی کروا چکے تھے لیکن وہاں جانے کا ارداہ تقریباً ترک کر چکے تھے ایسے لوگوں سے رشتہ جوڑنا انھیں گوارا نہ تھا جان بوجھ کر بچی کو سیاہ بخت رو ہونے کیوں دیتے۔

لیکن شہرت کے خط نے ان کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا کر چکا تھا ماں کی یاد دلا کر شہرت نے انصار علی کو اور بھی کمزور کر دیا تھا وہ اپنے ناتوان کاندھے پر شہرت کو تنہا کب تک اٹھائے رکھ سکتے تھے دل مضطرب ہوا تو انصار علی نے ڈرائیور کو اسٹیشن تک چھوڑ آنے کے لئے کار نکالنے کو کہا۔

پلیٹ فارم پر پہنچے تو گاڑی ایک گھنٹے تاخیر سے چلنے کی اطلاع ملی تو انھیں افسوس ہوا کہ اتنا آناً فاناً پروگرام بنالیا کہ شہرت کی پسند کی چیزیں بھی نہ لے پائے۔

پسند!...... شارب سامنے کھڑا ہو گیا۔

ایک ساتھ کھیلتے کودتے دونوں جوان ہوئے تھے۔ آج بچپن کی شرارتوں پر جوانی کی شوخی ابھر آئی تھی اور پھر نوعمری کی لمبی ٹانگوں نے مسافت کی دوری کو یک لخت سمیٹ لیا تھا۔ درمیان میں صرف اور صرف پاپا کی مرضی کی دیوار حائل تھی جسے شہرت پدرانہ شفقت کا واسطہ دیکر ڈھا دینا چاہتی تھی۔

انصار علی کو اپنی شہرت کی خوشی کیلیے سب کچھ گوارا تھا لیکن شارب کے پیچھے اس کے والد کا مکروہ چہرہ انھیں بُری طرح کھل رہا تھا۔ کمبخت کی ایک کل بھی سیدھی نہ تھی! شہر میں شیطانی دھندوں کے تمام خرافات اُسی کے ہاتھوں پل بڑھ رہے تھے، کوئی غیر قانونی دھندہ ایسا نہ تھا جس میں اس کا Lion Share نہ ہو۔ ٹرین کے آنے کے شور سے انصار علی کے خیالات منتشر ہو گئے۔ پلیٹ فارم کی ہماہمی بڑھ گئی ۔ ہر کوئی بھاگتا۔ دوڑتا نظر آرہا تھا۔ انصار علی نے بھی خود کو ٹرین کے اس ڈبے میں پھینک دیا جہاں ان کے نام کی لسٹ چپکی ہوئی تھی۔

ٹرین کب چل پڑی...... انصار علی کو اسکا علم تک نہ ہو سکا وہ تو سامنے سے آتی ہوئی ایک دوشیزہ نے اپنی نشست کے نمبر کی تصدیق کیلیے انھیں ٹوکا، تو انھیں احساس ہوا کہ گاڑی اپنی

پوری رفتار سے چل پڑی ہے۔

''انکل......آپ کا کیا نمبر ہے؟''نسوانی آواز ابھری۔

''اوں......میرا......Fourty One''انصار علی نے مختصر سا جواب دیا۔

''تو آپ اس طرف آجائیں......یہ Fourty Four میرا ہے''نسوانی آواز میں کھنکتے سکے کی سی کیفیت تھی۔

''بابا......Fourty Five،اور پرٹا تو مار''نسوانی آواز نے اپنے والد محترم کو ان کی سیٹ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

پھر آمنے سامنے بیٹھی دوشیزہ سے پل بھر میں ڈھیر ساری باتیں ہو گئیں جس میں وہ وقفہ وقفہ سے اس کے بابا بھی حصہ لیتے رہے دونوں باپ بیٹی کی گفتگو سے اتنا علم ہو چکا تھا کہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی شفقتیں نچھاور کرنے میں بازی لے جانے کی سعی کر رہے ہیں۔،دوشیزہ کی عمر کوئی ۲۵ / ۲۴ کی ہوگی۔باتوں کے درمیان پتا چلا کہ دوشیزہ Navy میں لیفٹیننٹ ہے اور والد محترم ایک فیکٹری کے ریٹائرڈ انجینئر ہیں۔بچی کی شادی کیلئے انجینئر صاحب پریشان ہیں کہ بچی کی اپنی ایک پسند تھی جس پر بادل نخواستہ انجینئر صاحب کا سر تسلیم خم تھا لیکن لڑکے کے گھر والوں کی اخلاقی قدروں کے خلاف ان کے پاس ایک لمبی فہرست تھی جسے دوشیزہ اپنی دانشمندی سے پرزہ پرزہ کر کے ایش ٹرے میں ڈالے جا رہی تھی۔

انصار علی باپ بیٹی کی ذاتی گفتگو میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتے تھے اس لئے الگ سمٹ آئے اور اٹیچی سے ایک رسالہ نکال کر ورق گردانی کرنے لگے۔

نظر تو رسالے پر تھی مگر دھیان بار بار دونوں کی گفتگو کی اور چلا جاتا......۔

''اور رنجیت کی بولو؟''انجینئر صاحب کی آواز آئی۔

''کی بولے!''نسوانی آواز میں درد تھا......''منیجر کو تھا بول چھیلو......کہ بابا سنگھیے کچھو Hot talk ہوئے''

''نا ہوٹ ٹاک کی ہوبے'' انجینئر صاحب نے اداس لہجے میں کہا۔
''اے کھن بول چھے ...... آپ نی کی دیکھیں، کوتو دیکھن ...... سونا، ٹاکا ...... اور بولس نہ بابا''
''باباراگ کورچھوکےنو ...... تمی تو جانو، تار بابا کینشو! ایکٹومنکھ کھولالوگ ...... کیتھو! رنجیت اے مون نوئے''
لیفٹینٹ قدرے سنجیدگی سے بولی۔
''تھاک تھاک' کال کے ہجیو بولے'' انجینئر صاحب خفا ہوتے ہوئے بولے۔
انصار علی باپ بیٹی کی گفتگو کے درمیان سینڈوچ ہوئے جارہے تھے۔ ان کے اندر بھی ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہورہی تھی۔ شہرت کی صورت کبھی ابھرتی تو کبھی شارب کی تصویر ...... اوران دونوں صورتوں کے درمیان اعلیٰ اقدار کی دبیز چادر تن جاتی۔ تب انصار علی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتیں اور جسم میں کپکپی سی طاری ہونے لگتی۔
شاید اسی کیفیت سے خود کو الگ رکھنے کیلئے انھوں نے ایکبار پھر اپنی توجہ دونوں کی باتوں کی اور ڈال دی۔
''رنجیت چھوٹی کو بے پاچھے'' انجینئر صاحب کی آواز ابھری۔
''Air Force چاکری تے چھوٹی! کونوٹھیک نائ'' نسوانی آواز میں کپکپی سی آگئی تھی۔ آنکھیں بھی ڈبڈباسی گئی تھیں۔
''دیکھو باپی! تو مارمنکھ دیکھے اونار کا چھے آمی گے ئے جھیلم اور آبار جابو ...... تو می مون خراب کو ریونہ ماں''
انجینئر صاحب نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔
انصار علی باپ کے اس فقیرانہ رویے پر خود کو سنبھال نہ سکے ...... ان کی طبعیت اور غیر ہوتی جارہی تھی انھیں ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے ان کے وجود کو برف کی سل پر رکھ دیا گیا ہو جہاں برف کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا وجود بھی قطرہ قطرہ پگھل رہا ہو۔ ◆◆◆

ساڑی

ساڑی

''یہ پریشانی زیادہ دنوں تک نہیں رہے گی''
''کیسے نہیں رہے گی، پریشانی تو اب میرا مقدر بن گئی ہے''
''خواہ مخواہ مقدر کو کیوں کوستی ہو''
''اب اسے مقدر کی خرابی نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ ساری امنگیں اور خواہشیں یک لخت دم توڑ چکی ہیں''
''خواہشوں اور امنگوں کا کیا...... آج بھی جوان ہوسکتی ہیں صرف ایک بار میں بستر سے اٹھ تو جاؤں''
''مانا بیوی کی امنگیں اس کے خاوند کی ترنگ میں ہیں لیکن سروس سے سبکدوشی کے بعد مرد ٹوٹ جاتا ہے''
''ٹوٹ جاتا ہے فنا تو نہیں ہو جاتا''
''ٹوٹ اور بکھر کر جینے کو بھی کوئی جینا کہتے ہیں''
''زینو، تم کو اپنے خدا پر بھروسہ نہیں رہا، تمام ضرورتیں تو وہی پورا کرتا ہے''
''میرے مجازی خدا تو آپ ہیں اور میری ضرورتیں آپ کی پریشانیوں کی نذر ہو گئیں''
''میں مجازی خدا کی نہیں، اس خدا کی بات کر رہا ہوں جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے''
میں انھیں کس طرح سمجھاتی کہ عورت کی خوشی مردوں کے ہشاش بشاش چہرے میں چھپی رہتی ہے اور یہاں آپ نیم جان ہو کر ناکامی کی دہلیز پر کھڑے ہیں اب آج ہی کی بات لے

لیجئے۔ گھنٹوں غسل خانے میں بیٹھی اپنی اکلوتی ساڑی کے سوکھنے کا انتظار کرتی رہی۔

کل کی بات ہی کچھ اور تھی آپ برسر روزگار تھے تنخواہ کے ڈھیر سارے روپے تھے اور کھانے کو صرف تین افراد تھے۔ خوب مستی تھی کیا ٹھاٹھ کی زندگی تھی اس وقت ساڑیوں کی کمی نہ تھی ہر ساڑی کیساتھ میچنگ بلاؤز منگواتی تھی زندگی اس وقت پوری ترنگ میں تھی۔ شوخ زندگی، اس پر آپ کی چاہت...... چاہت اور امنگوں سے بھرپور زندگی۔

لیکن آج چاہت اور اُمنگیں تو آپ کے بستر کے نیچے سسک سسک کر دم توڑ رہی ہیں۔ جب خاوند ہی بستر پر پڑا ہو تو زندگی میں شیرنیت کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

''کہاں کھوگئی زینو؟''

''میں آپ کے پاس ہی تو بیٹھی ہوں''

''بیٹھی تو بے شک آپ میرے قریب ہیں لیکن دل کہیں اور ہے''

''نہیں ایسی بات نہیں...... میں دراصل اپنی اس اکلوتی ساڑی کو دیکھ رہی تھی اب اس میں جان نہیں رہ گئی، جگہ جگہ سے مسک گئی ہے''

''ہاں! تم نے نئی ساڑی کیلئے کہا تو تھا کیا بتاؤں، میں نے عرفی کو کہا بھی تھا کہ اپنی ماں کیلئے ایک نئی ساڑی لا دو بیٹے۔ لیکن اس کے کان پر جوئیں تک نہیں رینگتیں۔ کم بخت جورو کا غلام ہو کر رہ گیا ہے''

''وہ ہفتے کے سو روپے پھینک جاتا ہے یہی کافی ہے اور پھر یہ کمرہ بھی چھوڑ گیا جس سے کرائے کے کچھ پیسے اٹھ جاتے ہیں ورنہ دانے دانے کو ترس جاتی''

''سو روپے دیتا ہے تو کوئی احسان نہیں کرتا۔ میرے Provident Fund کے سارے روپے تو وہی گول کر گیا''

''کاش اس وقت میں آپ کی بات مان لیتی اور ریٹائرمنٹ کے تمام روپے اس کے نام کرنے کو نہ کہتی تو آج یہ کسمپرسی کی زندگی دیکھنے سے بچ جاتی''

خاوند کارخانے میں اچھے خاصے افسر تھے ریٹائر ہوئے تو ڈھیر سارے روپے ملے تھے میں ہی مشورہ دیا تھا کہ ایک ہی تو اولاد ہے اور پھر ساری عمر اسی اولاد کی خوشیوں کیلئے تو جینا ہے اس سے چھپا کر پیسے رکھنے کی ضرورت ہی کیا۔ اسی کے نام رکھ دیتے ہیں مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی جلد سارے روپے کوڑے میں پھینک آئے گا۔ وہ تو بھلا ہوا دیور جی کا، جنھوں نے بروقت آگاہی کر دی کہ عرفی ساری دولت سٹے میں لٹا رہا ہے۔

دیور جی سوتیلے ہی سہی، مگر وقت پر وہی کام آئے، اس عالم پریشانی میں اگر وہ کھڑے نہیں ہوتے تو عرفی گرفت میں کبھی نہیں آتا۔

وہی تو عرفی کو ایک دن پکڑ کر لے آئے، کافی ڈانٹ پھٹکار پلائی۔ سخت سست، بہت کچھ کہا اور اس بات کیلئے راضی کیا کہ بوڑھے ماں باپ کو بطور خوراکی کچھ دے،

تب سے ابتک ہفتے کے سو روپے پھینک جاتا ہے بچے ماں باپ کی شفقتوں کو کتنی جلدی بھول جاتے ہیں.........

نو ماہ کی اذیتیں،

پرورش کی صعوبتیں،

اور برداخت کی مشکلیں،

والدین کس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے رکھتے ہیں لیکن ایک دن وہی بچہ اپنے بال و پر اس طرح جھاڑ کر اُڑن چھو ہو جاتا ہے کہ اس کی پرواز پر ماں باپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں اور تب اُن بوڑھی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو رہ جاتے ہیں۔

"تمہاری آنکھوں میں آنسو! کیا سوچنے لگیں کہ آنسو امنڈ آئے"

"اپنی قسمت کو کوس رہی ہوں۔ اللہ نے ایک ہی اولاد دی وہ بھی آنسو دے گئ"

"زینو تم زیادہ سوچا نہ کرو، ساڑی ہی کی تو ضرورت ہے آج تم وہ ساڑی نکال لو...... دو تین دنوں میں تمہارے لئے نئی ساڑی کا بندوبست ہو جائے گا"

''کہاں سے بندوبست ہو جائیگا۔ اس بستر پر کوئی ہن برسنے والا ہے''

''ہاں، ہن ہی سمجھو...... ساڑیوں کا نزول ہوگا''

''کیا آپ کو پیغمبری ملنے والی ہے کہ وحی کی جگہ ساڑیوں کا نزول ہوگا''

''کچھ ایسا ہی سمجھو، پیغمبری نہیں معرفت مل گئی ہے''

''آپ کی فلسفیانہ باتیں میری سمجھ میں کب آئیں جو آج آئینگی لیکن کہے دیتی ہوں، میں اس ڈھلتی عمر میں وہ ساڑی نہیں پہنوں گی''

''ساڑی سے عمر کا کیا تعلق، ساڑی تو ستر پوشی کیلیے پہنی جاتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس چٹک مٹک کی ساڑی پر لوگ کیا کہیں گے''

''تمہیں لوگوں کی پڑی ہے اور میری ذرا بھی فکر نہیں، تمہیں میری خوشیوں کیلیے یہ ساڑی پہننی چاہیے''

ان کی ضد کے آگے میں نے سپر ڈال دی اور وہ ساڑی زیب تن کر لی،۔ برسوں سے یہ ساڑی میں نے اپنی بہو کیلیے محفوظ رکھ چھوڑی تھی بیٹے کی شادی کے بعد ایک دن نئی نویلی دلہن کو قریب بیٹھا کر اپنے دو ایک گہنے جو تھے اس کی نذر کر دی اور ساتھ میں یہ کام دار ساڑی بھی۔

بہو نے زیورات کا ڈبہ تو خوشی خوشی لے لیا۔ لیکن ساڑی دیکھتے ہی ناک بھوں سیکوڑ کر بولی......۔

''اماں! آپ تو جانتی ہیں کہ میں ساڑی بہت کم پہنتی ہوں اور پھر یہ ساڑی بھی آوٹ ڈیٹیڈ سی ہے ویسے بھی کام دار ساڑی میرے جسم پر کانٹے کی طرح چبھتی ہے''

میں نے محسوس کیا کہ جینز جیکیٹ والی بہو کے جسم پر نرم ریشم چبھے کی کام دار ساڑی ضرور چبھے گی اور میں نے ساڑی بکس کے ایک گوشے میں ڈال دی۔

آج وہی ساڑی زیب تن کئے ان کے سامنے کھڑی تھی وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہے تھے ان کی نظروں سے میں گھائل ہو کر سمٹی چلی جا رہی تھی کہ انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا میں نے

بھی ان کے بیمار ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہاتھوں کی حدت میں، میں نے زندگی کی
تروتازگی کو محسوس کیا اور پھر میں ان کا ہاتھ تھامے، ماضی کی حسین وادیوں میں کھوگئی۔

نئی نویلی دلہن،

ماتھے پر بندیا، کانوں میں جھمکے اور ہاتھوں میں مہندی کی لالی......،

''تمہارے ہاتھ کتنے نرم ہیں''

وہ میرے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولے اور پھر وہ میرے نرم، ملائم اور
گورے گورے مہندی والے ہاتھوں کو کبھی ہونٹوں سے تو کبھی آنکھوں سے گھنٹوں چومتے رہے
انگلیوں کی پور پور سے کھیلتے کھیلتے ان میں اتنی گرمی پیدا کر دی کہ میرا سارا جسم پسینے سے بالکل
بھیگ گیا اور میں بے بس ہو کر ان کی گود میں لڑھک گئی۔

جب آنکھ کھلی تو میرے ہاتھ میں ان کا ہاتھ تھا، جو سرد ہوا جا رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ میرے
ہاتھ پر ان کی گرفت سخت ہوگئی تھی میں نے اپنے دوسرے ہاتھ کی مدد سے جب ان کا ہاتھ
چھڑایا تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی میری چیخ پر اڑوس پڑوس اور گھر کے سارے لوگ جمع ہو
گئے اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

ہوش میں آئی تو عرفی سامنے کھڑا تھا میں نہیں چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر زار و قطار
رونے لگی۔ سامنے جینس پینٹ میں ملبوس بہو کھڑی تھی۔ عرفی کی آنکھیں تر بتر تھیں جیسے
ندامت کے آنسو جسم سے آنکھوں کے ذریعہ بہہ جانا چاہتے ہوں۔

گھر میں موجود سارے افراد عرفی کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے کہ اس کی
حرکتوں سے کم و بیش سبھی واقف تھے یہاں تک کے میرے خاوند کی موت کے ذمہ دار بھی لوگ
عرفی کو ہی سمجھ رہے تھے لیکن میں نے دل کو تسلی دے لی تھی کہ موت تو برحق ہے ذمہ دار کون ہو
سکتا ہے؟ ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے آج ان کی، کل ہماری باری ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد میرے خاوند کی میت کو پیوند خاک کرنے کیلئے لوگوں نے جب

اٹھایا تو ایسا لگا کہ میری میت اٹھائی جارہی ہو، سرخ، شوخ ساڑیوں کو، رنگیں، چوڑیوں اور خوبصورت زیبائشوں کو چار اشخاص کاندھے پر اٹھائے قبرستان کی اور جارہے تھے جیسے وہ لوگ میری تمام امنگوں اور خواہشوں کو سفید کفن میں لپیٹے لحد کے نیچے بہت نیچے اتار دینا چاہتے ہوں یہاں کی تاریکی، گھنگھور تاریکی سے میں گھبرا گئی۔ خاک ہی تکیہ، خاک ہی بچھونا، خاک ہی خاک، زندگی خاک نظر آرہی تھی۔

لوگوں نے مجھے جگایا، میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، میری ناک بند کر کے میری سانسوں کے عمل کو جاری رکھنا چاہا کہ مجھے ابھی اور اذیتیں جھیلنی تھیں۔

آنکھ کھلی تو میں حصار میں تھی چاروں طرف سے عورتیں مجھے گھیرے میں لئے تھیں عرفی پاس ہی بیٹھا تھا۔

''اماں...... خود کو سنبھالو''

''اب کیا سنبھالوں...... سنبھالنے والی چیز ہی کہاں رہی''

''آج ابا کے ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی کا نظم کیا گیا ہے''

''ہاں بیٹے، تمہارے ابا ہم سبھوں کے گناہ گار تھے ان کیلئے ایصال ثواب ضرور کرو''

میں نے محسوس کیا عرفی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے سامنے بہو اپنی رنگین ساڑی کا پلو سمیٹے غم زدہ کھڑی تھی جو شاید آنکھوں آنکھوں میں ہی عرفی کو ڈھارس بندھا رہی تھی۔

مجھے سفید ساڑی میں لپیٹ دیا گیا تھا اور میں بھی سفید ساڑی میں لپٹی، سمٹی سمٹائی ایک گوشے میں پڑی، اندر ہی اندر سسک رہی تھی۔ لوگ آتے، تسلی کے دو بول بولتے اور ساتھ میں لائے ہوئے پولیتھن کا پیکٹ میری اور بڑھا دیتے۔

میرے سامنے پولیتھن کے پیکٹ کا ڈھیر لگ گیا تھا کہ اس ڈھیر سے ایک آواز ابھری ہاں! ہن ہی سمجھو...... ساڑیوں کا نزول ہوگا

رشتہ

رشتہ

آج اس کی یاد شدت سے آرہی ہے۔

''کس کی'' بیوی نے ٹھوکا لگایا۔

''ارے وہ کم بخت، اپنا یار رہوا کرتا تھا کبھی'' میں نے سرسری تعارف پیش کیا۔

''آخر آپ کا وہ یار کم بخت کیسے ہو گیا''

بیوی کی گرفت پر میں گھبرا گیا اور بات کو ٹالتے ہوئے میں نے کہا۔

''ارے بھائی...... کم بخت کا استعمال قربت کی بنا پر کیا ہے''

''آخر وہ یار ہے کون؟ جس کی یاد آپ کو بُری طرح ستا رہی ہے آج تک تو آپ کی زبان سے اس کم بخت کا ذکر نہیں سنا'' بیوی نے بال کی کھال کھینچنی شروع کر دی۔

''میں اسے بھول جانا چاہتا تھا'' میں نے پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی۔

''کیوں؟'' بیوی کی بے قراری بڑھ گئی۔

''وہ کام ہی کچھ ایسا کر گیا تھا کہ اسے بھول جانے میں ہی عافیت ہے''

''کیسا کام؟''

''سنو گی!'' بیوی کی بے تابی دیکھکر میں نے کہا۔

''کہئے بھی تو'' بیوی خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''کم بخت، عین شادی کے دن اپنی بہن کو لیکر فرار ہو گیا تھا''

''کیا؟'' بیوی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

یقین نہیں آیا نا مجھے بھی جب یہ خبر ملی تو یقین نہیں آیا تھا۔

لیکن یہ سچ ہے۔

اس روز بارات کی آمد کے ہم لوگ منتظر تھے۔ سبھی ساتھی باراتیوں کے استقبال میں مصروف تھے انظار میرا یار مصروف کم نڈھال زیادہ تھا اس کی اس حالت پر میں نے کئی بار ٹوکا۔ لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ بہن کی جدائی کے غم میں پژمردہ ہو جانا فطری عمل ہے۔

بارات آئی، باراتیوں کی شاندار آؤ بھگت کی گئی۔ شربت اور نمک پارے پیش کئے گئے پھر نکاح کے کپڑے اندر بھجوائے گئے۔ تب فریقین کی جانب سے گواہوں کا انتخاب عمل میں آیا اور پھر لڑکی سے اجازت کیلئے قاضی کے ہمراہ گواہ حضرات کیساتھ میں بھی اندر گیا۔ گواہوں کی فہرست میں، میں بھی شامل تھا اس لئے ساتھ ساتھ رہا۔

قاضی شہر کی بلند آواز سنتے ہی انظار کی بہن نوید پر غشی طاری ہو گئی۔ وہ نیم جان سی ہو گئی۔ انظار نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ فرش پر لڑھک گئی ہوتی۔

کاروائی فوراً روک دی گئی، ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ قاضی صاحب نے پانی منگوا کر نوید کے منہ پر چھینٹے بھی مارے اور کچھ پڑھ کر دم بھی کیا۔ ڈاکٹر نے سوئی لگائی اور دوا کی ایک فہرست انظار کے حوالہ کر کے چلا گیا۔ انظار پاس ہی بیٹھا نوید کا سر اپنے زانو پر رکھے اسے تسلی دیتا رہا۔ اس وقت انظار کی بے چارگی اور بے بسی کا بیان ممکن نہیں۔

سبھی لوگ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر ترس کھانے لگے، بھائی کو بہن سے اتنی انسیت پر لوگ دنگ تھے بڑی بوڑھی عورتیں کہنے لگیں۔

''انظار کا چہرہ کتنا پھیکا پڑ گیا ہے''

''بہن کو کتنا چاہتا ہے''

''اس کی جدائی کیسے برداشت کر پائے گا''

نوید کی حالت یوں تو سدھرتی جارہی تھی لیکن انظار کی کیفیت دگرگوں تھی اس نے نقاہت بھری آواز میں حاضرین سے گذارش کی کہ نوید کو کچھ لمحوں کیلئے تنہا چھوڑ دیں۔ بھیڑ بھاڑ اور ہنگامے سے اس کی حالت بگڑ گئی ہے اور پھر یکے بعد دیگرے سبھی لوگ آہستہ آہستہ چلے گئے۔ بچے رہے صرف نوید اور انظار۔

''دونوں بھائی بہن تھے کسی کو اعتراض کیوں ہوتا''

''ہاں! بھائی بہن کے پاک رشتے پر حرف لگانا ممکن نہ تھا''

تھوڑی دیر میں انظار باہر آیا اور کہا..........

''نوید کی حالت بگڑتی جارہی ہے اس کو اسپتال لے جانا ہوگا''

اور پھر ٹیمپو بلوایا اور نوید کو بیٹھا کر جو یہاں سے گیا سو آج تک نہیں لوٹا۔

میں کافی تھک گیا تھا یا یوں سمجھئے ماحول کی پراسرار خاموشی سے ڈر گیا تھا اسی لئے گھر چلا آیا کہ طبعیت کہیں بگڑ نہ جائے۔

''کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو گا۔ پولس نے تفتیش نہیں کروائی'' بیوی نے اپنی لاعلمی کا پلندہ کھول دیا۔

''ہاں......اسے حادثہ ہی کہیں گے۔ وہ نوید کو لیکر فرار ہو گیا تھا''

''یہ بھی کوئی بات ہوئی...... بھائی،،بہن کو لیکر کہاں فرار ہو سکتا تھا، یہ ممکن ہی نہیں'' بیوی وکیل صفائی کی طرح جرح کرنے لگی۔

''ہاں، مجھے بھی یقین نہیں ہورہا تھا'' میں نے بیوی کو سمجھایا۔

''لیکن!''

''لیکن کیا'' بیوی کی اضطرابی کیفیت دیکھکر میں نے کہا۔

''ہم لوگوں نے پولس اسٹیشن، ریلوے اسٹیشن، سرکاری اور غیر سرکاری سبھی اسپتالوں کا چکر لگایا لیکن کہیں پتہ نہ چلا''

''واقعی آپ کا دوست بڑا کم بخت نکلا'' بیوی نے آخری فیصلہ سنا دیا۔

''لیکن انظار ایسا نہ تھا'' میں نے تفصیل سے بتایا۔

''وہ پڑھا لکھا، سائنس، گریجویٹ تھا۔ تعلیمی ماحول یعنی بورڈنگ میں پرورش ہوئی تھی اس کی اچھی سوجھ بوجھ رکھتا تھا لیکن معلوم نہیں کیا ہوا تھا کہ اچانک بگڑ گیا۔ اس کی اس حرکت پر میں اس سے سخت ناراض تھا۔ شاید اسی لئے اس دن جب اس کا خط آیا تو بغیر پڑھے میں نے اسے پھاڑ دیا''

''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا''

میں نے بھی سوچا یہ ٹھیک نہیں اس لئے اٹھ کر دوبارہ پھٹے ہوئے خط کو یکجا کیا مگر آدھا تیتر آدھا بیٹر ہو کر رہ گیا تھا۔ مکمل پڑھ نہیں پایا۔

خط کے کچھ ٹکڑے ہوا سے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے لیکن جہاں تک پڑھ پایا تھا اس سے اندازہ ہوا کہ نوید اس کی اپنی بہن نہیں سوتیلی بہن تھی۔

''بہن تو بہن ہوتی ہے اس میں اپنی اور سوتیلی کا فرق کیا معنی رکھتا ہے''

''یہ درست ہے'' میں نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا'' بہن تو پیار کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ احترام کے قابل ہوتی ہے۔

''ہاں! یہ تو سوتیلی ہی تھی یہاں تو منہ بولی بہنوں سے لوگ راکھی بندھواتے ہیں'' بیوی کچھ فلسفیانہ جواز پیش کرنے لگی۔

اس لئے تو میں اس کے ادھورے خط کو پڑھنے کے بعد فوراً اس کے والد سے ملا تو وہ کہنے لگے۔

''بیٹا! اب تم سے کیا چھپانا............تم تو قریب قریب جان ہی چکے ہو، لوگ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ دونوں سوتیلے بھائی بہن ہیں اور میں بھی اسے واضح کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن آج میں

تمہیں وہ سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں جو یہاں شاید کوئی نہیں جانتا۔ اس سے شاید میرے سینے کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میں اپنے گاؤں کا مکھیا ہوا کرتا تھا اپنی شان تھی آن بان تھی، کھیت، کھلیان کیا کچھ نہیں تھا، نوید اس وقت پیدا نہیں ہوئی تھی اور میری بیوی اکثر بیمار رہا کرتی تھی۔

اسی درمیان انظار کی ماں سے ملاقات ہوئی۔ وہ بیوہ تھی، میرے گھر کام کاج کیا کرتی تھی، ذرا خوبصورت تھی، بیوی کی بیماری اور اس کی خوبصورتی کے درمیان میں کھڑا تھا کہ معلوم نہیں کب میرا پاؤں پھسل گیا۔ مجھے خود بھی خبر نہیں ہوئی، میں نے فوراً نکاح ثانی کی تجویز پیش کر دی۔ وہ تو انظار کے مستقبل کی دہائی دینے لگی ۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اس کا مستقبل روشن رہے گا۔ یہاں مرے پاس کس چیز کی کمی ہے اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ اچھی زندگی دوں گا۔

اس وقت انظار آٹھ نو سال کا ہوگا۔ پرائمری تعلیم گاؤں میں ہی مکمل کر لی تھی میں نے شہر کے بورڈنگ اسکول میں داخلہ کروا دیا، جہاں اس کی تمام ضرورتیں پوری کرتا رہا۔

اِدھر گاؤں کی تبدیلی دیکھکر میں گھبرا گیا۔ یہاں آیا...... شہری زندگی دیکھی، بہتر اسی میں سمجھا کہ بنگال کے اس فولادی شہر میں پناہ لے لی جائے۔ وہاں کا سب کچھ بیچ کر یہاں کاروبار کر لیا۔ اس درمیان میری بیمار بیوی نوید کو جنم دے چکی تھی۔ شہر میں آنے سے قبل اس کی ماں کا ساتھ رہا کہ ایک دن نقاہت نے اس کی جان لے لی۔

انظار گریجویشن کے بعد یہاں لوٹ آیا۔ لیکن وہ مجھ سے خوش نہیں تھا اکثر کہتا تھا ''میری ماں کو یہاں بھگا کر لے آئے ہیں''

میں سمجھاتا نہیں بیٹے ...... نکاح کر لایا ہوں تو وہ اور بپھر جاتا اور کہتا...... ''میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا

تو میں سمجھاتا ''نہیں بیٹے، اتنا غصہ نہیں کرتے، میں تمہارا باپ ہوں۔ کسی چیز کی کمی ہونے دی

ہے تمہیں''

لیکن وہ ہمیشہ اینگری مین ہی بنا رہا، انتشار اور خلفشار ہی برپا کرتا رہا۔

اور آخر اس نے بدلہ لے ہی لیا۔ میری نوید کو بھگا کر لے گیا۔ مجھے رسوا کیا، میری عزت خاک میں ملا کر رکھ دی، نوید ہی صرف میری بیٹی تھی''

انظار تو اپنی ماں کا بیٹا تھا۔

''پھر بھی دونوں ہوئے نا بھائی بہن'' بیوی نے کچہری کی دیوی کی طرح آپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔

''ہاں...... لیکن نہ سگے، نہ سوتیلے'' میں نے بیوی کی آنکھوں سے پٹی ہٹاتے ہوئے کہا۔

''بدلے کی آگ کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا کہ اس میں انسان خود بھی جلتا ہے اور دوسرے کو بھی جھلسا دیتا ہے''

احساس
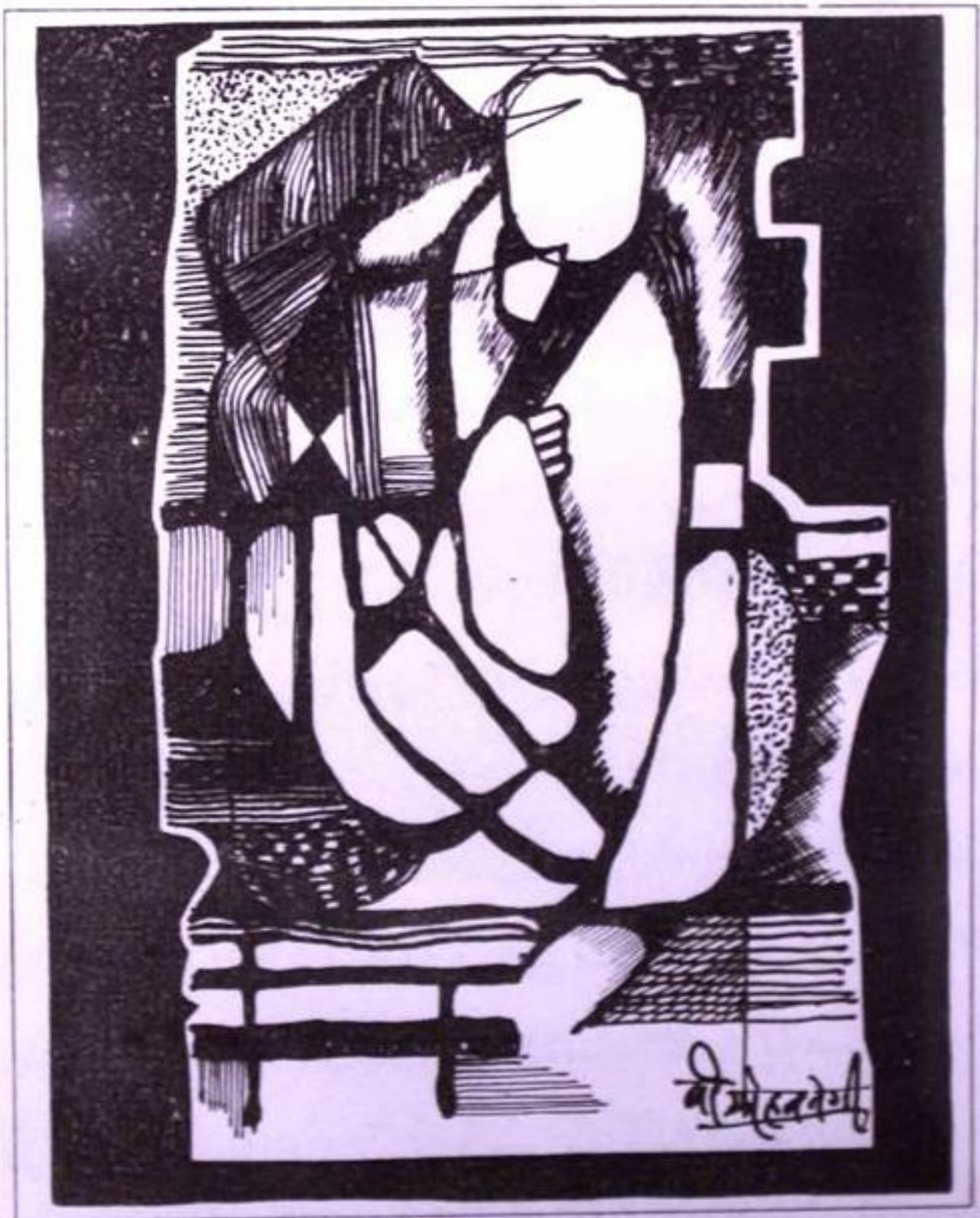
احساس

وہ بے ہوش پڑا تھا۔

روشنی اسے گود میں سمیٹے اپنی ممتا کا واسطہ دے رہی تھی۔

"بیٹا اپنی آنکھیں کھول بیٹا، آنکھیں کھول...... تیری خاموشی میری جان لے لے گی، اپنی ماں کی خاطر آنکھیں کھول، تو کیوں روٹھ گیا۔ میری ممتا میں کونسی کمی رہ گئی بیٹا"

بیٹا روٹھ چکا تھا اس کی آنکھیں اور نبض ڈوب رہی تھیں روشنی کی ساری امیدیں اسی سے بندھی تھیں امیدوں کا بندھن ٹوٹتا نظر آرہا تھا۔ ویسے تو امیدیں انسان کی آخری سانس تک قائم رہتی ہیں شاید اسی لئے وہ آس کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتی تھی کہ منا، راجو کی آخری نشانی تھا اور غریب ماں کی ساری پونجی۔

روشنی رئیس باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ بڑے نازوں میں پلی تھی۔ اپنی چھوٹی سی چھوٹی خواہش کو منٹوں میں پورا کروالیتی۔ ویسے گھر میں کسی چیز کی کمی بھی نہ تھی۔ کمی تھی تو بس پیار کی۔

روشنی کے پاپا شہر کے معروف تاجر تھے۔ ان کو اتنی فرصت کہاں کہ اپنی بچی کو سینے سے لگا کر پیار کر لیتے رات گئے لوٹتے، صبح تڑکے نکل جاتے وہ تو دادی ماں کی گود میں پلی، بڑھی اور جوان ہوئی تھی۔ لیکن دادی ماں بھی کب تک ساتھ نبھاتی، ضعیفی اور نقاہت نے آگھیرا تو ہاتھ جھاڑ

کر اوپر اٹھ گئیں۔

اب روشنی تنہا رہ گئی تھی دادی اماں کی موت کے بعد وہ اور بھی ٹوٹ گئی تھی کالج سے گھر آتی تو گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اس وقت اسے دوستوں کی صحبت بھلی لگتی کہ تنہائی توڑنے لگی تھی شاید ایسے ہی کسی لمحے میں راجو سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، باتیں ہوئیں اور باتوں کے درمیاں انسیت اور چاہت کی دبیز چادر تن گئی۔

راجو غریب گھر کا چشم و چراغ تھا مگر خوبرو اور ذہین تھا۔ اس کا گھٹیلا جسم اور پروقار چہرہ روشنی کی آنکھوں میں اتر گیا تھا اس کی غریبی و مفلسی سے روشنی کو کیا لینا دینا تھا کہ روشنی کو تو اس کی غریبی بھی پسند تھی۔

راجو اب اسکی سانسوں میں رچ بس گیا تھا۔ روشنی راجو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتی تھی۔ اس کی قربت میں روشنی کو فرحت ملتی، راحت کا احساس ہوتا۔

راجو غریب مگر حساس طبعیت کا مالک تھا وہ ڈرتا تھا کہ اپنی مفلسی کی آگ میں کہیں روشنی کا جھلسا نہ دے وہ اکثر سوچتا۔ روشنی کی جگمگاتی زندگی کو اس اندھیر کوٹھری میں مقید کرنا مناسب نہیں۔ وہ گھٹ گھٹ کر یہاں مرجائے گی۔

لیکن روشنی کی روشن طبعیت کو کون روک سکتا تھا وہ تو بس چاہت کی دیوانی تھی۔ راجو کی انسیت میں وہ زمین آسمان، جنس و جان سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی۔

روشنی کے پاپا، روشنی کی چاہت پر ضرب لگانا نہیں چاہتے تھے لیکن اسے اس طرح بربادی اور غریبی کے دلدل میں گرتے بھی دیکھ نہیں سکتے تھے ایک دن سمجھا کر کہا............ "بیٹی ...... تمہاری خوشی میرے لئے مقدم ہے لیکن ذرا سنجیدگی سے سوچ لو بیٹی۔ وہ گھر تمہارے قابل نہیں۔ راجو تمہیں خوشیاں دے سکتا ہے لیکن ضروریات زندگی کے منہ کھلے سپاٹ خلیج وہ پاٹ نہیں سکتا"

"پاپا...... میں سونے میں گوندھے لکھنو کے ترنوالے پر۔ خوشیوں پر سینکی گئی۔ خشک چپاتی کو

ترجیح دوں گی‘‘

تب ایک دن اس کے پاپا نے راجو کو بلوایا اور اپنی بیٹی کی خوشیوں کی خاطر اسے اپنے کاروبار میں شرکت کی دعوت دی لیکن خوددار راجو اپنی انا کو گروی رکھ کر خوشیاں خریدنا نہیں چاہتا تھا اس نے دوٹوک فیصلہ سنادیا۔

’’بھیک میں پائے گئے چاندی کے سکوں پر خوشیوں کی عمارت نہیں کھڑی کی جاسکتی، میں روشنی کو اپنی قوت پر خوش رکھنا چاہوں گا‘‘

اور پھر روشنی نے راجو کیساتھ سیول میرج کرلیا۔ روشنی کے پاپا اسے اپنی ناکامی تصور کر کے خاموش ہوگئے.........۔

’’بیٹا آنکھیں کھول‘‘ روشنی کی بس ایک ہی رٹ تھی۔ گاؤں کے سبھی لوگ روشنی کو گھیرے تسلی کے بول بول رہے تھے کوئی روشنی کو سہارا دیتا تو کوئی منا کی ڈوبتی نبض کو دیکھتا۔

’’روشنی، اس کی آنکھیں تو ڈوب رہی ہیں‘‘ پہلے نے کہا

’’ہاں اب تو اس کا چہرہ بھی پیلا پڑ رہا ہے‘‘ دوسرے نے کہا۔

تیسرا ڈاکٹر کو بلانے کیلئے دوڑ پڑا.........

روشنی اپنے راجو کو بھی اسی طرح سسکتے، دم توڑتے دیکھتی رہی تھی۔

راجو اپنی غریبی سے تنگ آچکا تھا غربت کی تپش میں گبرو جوان بھی پگھل کر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ راجو اپنی اعلیٰ تعلیم کے باوجود کوئی ڈھنگ کی نوکری نہ پاسکا تھا۔ بس دو وقت کی روٹی جو ایشور کے ذمے تھی وہ مل جایا کرتی تھی۔۔ گاؤں کے پبلک اسکول میں بچوں کو درس دیتا۔ ہاں لوگوں میں عزت و مقبولیت کافی بڑھ گئی تھی اس طرح پیٹ کی آگ تو جوں توں بجھ ہی جاتی لیکن سپنے! وہ تو ادھورے ہی رہ گئے۔ بس لے دے کے یہ ایک دو کمرے کا پھونس کا ایک مکان ہی بنا پایا تھا جہاں وہ دونوں اپنے اپنے ادھورے سپنوں کے ان گنت قصے دفن کرتے رہتے۔ روشنی تو راجو کی چاہت میں غریبی و مفلسی کی چادر میں مست نظر آتی اس کے سامنے دنیا کی دولت تو

راجو اور اس کی بے پناہ محبت تھی لیکن راجو ہمیشہ نڈھال رہتا اسے ایسا لگتا جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔

''تمہیں ایسا کرنا نہیں چاہئے تھا، یہ جرم ہے''ضمیر کی آواز ابھری۔

''نہیں نہیں جرم نہیں...... محبت ہے''

''محبت تو اندھی ہوتی ہے تم اندھے نہیں تھے۔ جان بوجھ کر روشنی کو غریبی کے دلدل میں کھینچ لینا ۔جرم نہیں تو اور کیا ہے''؟

''ایسا تو وہ بھی چاہتی تھی''

''وہ تو نادان تھی''

'' کیوں، کیا سوچنے لگے''روشنی نے راجو کو جھنجوڑا۔

''کیوں ہمیشہ سوچ کے دریا میں غوطے لگاتے رہتے ہو۔ سوچنے سے مستقبل روشن نہیں ہو جاتے اور اب تو سوچنا بند کر دو کہ......''

''کیوں، اب کیا ہو گیا؟''

''اب تم باپ بن گئے، میرا مطلب عنقریب باپ بننے والے ہو''

''گویا تمہارا مسیحا آنے والا ہے وہ تمہیں ضرور اس غریبی کے دلدل سے نکال لے جائے گا...... روشنی یقین کرو''

''ہاں...... صرف مجھے نہیں، ہم دونوں کو''

''نہیں روشنی! میرے مقدر میں جتنی روشنی ملنی تھی مل گئی''

''آپ نراس کیوں ہوتے ہیں''

''اپنی حالت کا مجھے علم ہے نا''

''آپ ٹھیک ہو جائیں گے''

''اس خون کی قے سے کون نجات پا سکا ہے خون جب جسم سے بہہ نکلتا ہے تو نسیں سوکھ جاتی

ہیں''

''میں اپنا خون انڈیل دوں گی لیکن آپ کو............''

لیکن ہوا وہی............ جو ایشور کو منظور تھا۔

راجو خون کی قے کرتے کرتے ایک دن نڈھال ہو گیا۔ روشنی اپنی ٹوٹی پھوتی ہمت کو سمیٹے کر راجو کو تسلی دیتی رہی اس کے سر کو اپنی گود میں لئے ایشور سے اپنے سہاگ کی سلامتی کی بھیک مانگتی رہی لیکن اس کا فیصلہ تو اٹل ہوا کرتا ہے اسے کون ٹال سکا ہے بھگتی کی شکتی نے بھی کبھی کبھی ہار مان لی ہے۔

نہیں بیٹے ایسا نہیں ہو سکتا تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا تمہارے پاپا نے تجھے میرا مسیحا بتایا تھا روشنی بیٹے کو سینے سے چمٹائے زار و قطار رونے لگی۔

ڈاکٹر کے آتے ہی ماحول میں خاموشی چھا گئی۔ مگر روشنی چیخے جا رہی تھی پاگلوں کی طرح بک بک کئے جا رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب اسے بچا لیجئے۔ یہ میرے راجو کی نشانی ہے میرا مسیحا ہئے۔ یہ نہیں ہو گا تو میرا کیا ہو گا، ابھی تھوڑی دیر قبل ٹھیک ہی تھا۔ بارش کے زور سے چھونپڑی کی گانٹھیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ منا اسے ہی درست کرنے لکڑی کی سیڑھی پر چڑھا تھا کہ تھوڑے ہی وقفے میں پھسل کر زمین پر آ گرا۔ گذشتہ برسات میں ساری گانٹھیں خود ہی کسی تھیں اس وقت کچھ نہیں ہوا۔ صرف ذرا خراش آئی تھی۔ آج تو صرف اس ڈھیلی گانٹھ کو کسنے گیا کہ تھا پھسل گیا اس وقت سے اب تک بے ہوش پڑا ہے آنکھیں نہیں کھولتا۔

ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ سرد ہوتے ہوئے جسم پر نبض کی رفتار ابھی قائم تھی وہ کچھ کہنا ہی چارہا تھا کہ سامنے روشنی کی تر آنکھیں دیکھکر اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اور آنکھیں اوپر ٹوٹی ہوئی بندھن کی اور اٹھ گئیں جیسے منا درست کرتے ہوئے پھسل کر زمین پر آ گرا تھا۔ وہاں اوپر، ایک پرانی رسی سے بندھا ایک سوکھا سانپ جھول رہا تھا۔

منا کی نبض ڈوب رہی تھی جسم سرد پڑتا جارہا تھا ڈاکٹر نے بغور معائنہ کے بعد روشنی کو تسلی دیتے ہوئے کہا......

'' فکر کی کوئی بات نہیں...... دراصل اس رسی سے بندھے سوکھے سانپ کو دیکھکر اس کے اندر کا احساس جاگ اٹھا اور گذشتہ سال کی اس کھروچ کو اس کی وجہ سمجھ بیٹھا۔ اسی لئے غشی طاری ہوگئی ہے اور کوئی بات نہیں۔

میں سوئی لگادیتا ہوں اور یہ دوا باہر سے آپ منگوالیں۔ ایشور نے چاہا تو دو تین گھنٹے میں ہوش آجائے گا''۔

روشنی ایک ٹک منا کو دیکھے جارہی تھی کہ کانوں میں راجو کی آواز گونجی............

'' تمہارا مسیحا...... تمہیں ضرور اس غریبی کے دلدل سے نکال کر لے جائے گا''

پہچان

پہچان

پہچان کا مسئلہ ہی اصل مسئلہ ہے سارے مسائل اسی سے جڑے ہیں۔ اب تو شناختی کارڈ کی اہمیت کو برصغیر نے محسوس بھی کرلیا ہے۔ اپنے چہرے پر اپنی شناخت کا ٹھپہ لگائے ہر کوئی گھوم رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صفر کی پہچان نہ ہو تو ہندسوں کی اہمیت وقدر کہاں رہ جاتی ہے اگر ان ہندسوں کا صحیح استعمال نہیں کر پائے تو صفر، تو صفر ہی ہو کر رہ جائے گا۔ صفر کو تو اربوں تک پھیلنا ہے کہ پھیلنا اس کی ضرورت ہے اور مقدر بھی۔

لیکن وہ پھیلنا نہیں چاہتا تھا وہ تو خود کو بند کتاب کی طرح ایک شلفِ میں سمیٹ لینا چاہتا تھا اسے اپنی شخصیت کو کسی پر کھولنا گوارا نہیں تھا اسے ڈر تھا کہیں دوبارہ وہ بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے اور ماضی کی طرح ایک بار پھر وہ ٹوٹ کر بکھر نہ جائے اور مستقبل بھی ماضی کی اور چھور کو سلجھانے میں ہی گذر جائے۔

اُس دن بس اپنے آخری پڑاؤ پر آکر رک گئی تھی۔ مسافر اتر کر اپنی اپنی منزل کی طرف چل دئے تھے ڈرائیور بھی دوبارہ سفر پر نکلنے سے قبل خود کو تروتازہ رکھنے کیلئے۔ سامنے کی ٹی اسٹال کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ بس سے اتر کر سمت کی گمشدگی پر حیران تھا وہ سمت کی پہچان تو رکھتا تھا لیکن یہاں سمتوں کی بھول بھلیوں میں وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

یورپ پچھم کے درمیان وہ چند ثانئے جھولتا رہا پھر جس بس سے وہ اترا تھا اس کو بغور دیکھا اور اس کے انجن کی سمت بڑھتا گیا......... چلتے چلتے کافی دور نکل آیا تو اسے احساس ہوا کہ سامنے دامودر ندی کا پاٹ گم تھا اور ندی پر پرکھوں کا بوسیدہ سا پل بھی لاپتہ تھا۔

وہ گھبرا گیا اور ہمیشہ کی طرح صرف اپنے گناہوں کی باتیں کرنے لگا اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی معافی چاہتا......... اور گھنٹوں سر جھکائے گڑگڑاتا رہتا اور جب آنکھیں تر ہو جائیں اور سارے آنسو بہہ نکلتے تو جسم کو ہلکا محسوس کرتا۔ تب وہ خود کو بستر پر دراز کر لیتا اور بستر پر پڑے پڑے نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہتا۔

اس روز بھی وہ اسی عمل سے گذر کر بستر پر پڑے پڑے سوچ کی تاریک ڈگر پر بھٹک رہا تھا۔ کبھی خیموں سے ٹکراتا تو کبھی بس اسٹینڈ کے سپاٹ کھمبوں سے الجھتا۔ اس وقت اس کا دل بالکل اُچاٹ سو جاتا نہ کچھ کرتے بنتا اور نہ کچھ کہتے۔

وہ پل کی گمشدگی پر قدرے حیران تھا شاید اسی لئے اس نے سامنے سے آتے ہوئے سن رسیدہ شخص کو پل کی تصدیق کیلئے روکا۔

''حضور والا......... یہاں ایک ندی تھی۔ اس ندی پر پل تھا'' اس نے ٹوٹے پھوٹے جملوں سے تاریخی حقیقت کو اُجاگر کرنا چاہی۔

سن رسیدہ شخص نے تعجب خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا، پھر کہا ''تم کس ندی اور کون سا پل کا ذکر کر رہے ہو؟'' ''وہی جسے دو زبانوں اور دو قوموں کی تہذیبی وراثت کا درجہ دیا گیا تھا'' اس نے سیاسی صفحہ کھول دیا۔

''اچھا اچھا......... وہ جسے پاٹا تو گیا تھا دو صوبوں کے درمیان ثقافتی و تہذیبی ارتقاء کیلئے لیکن بدقسمتی سے اسے دو ریاستوں کے درمیان خط امتیاز بنا دیا گیا۔''

''ہاں! ہاں حضور، مجھے اسی پل کی تلاش ہے''

''تب تو بیٹے تم غلط سمت نکل آئے ہو......... تمہیں تو پچھم کی جانب بڑھنا تھا مگر تم یورپ کی طرف

چلے آرہے ہو''ضعیف ونحیف شخص نے رہبری کی۔

پروجوں نے تو سمت کی پہچان اسے کرائی تھی لیکن آج سمت پراس کی گرفت کیوں کر ڈھیلی پڑگئی۔ یہ سوچ کر وہ اداس ہو گیا تھا اداسی تو شاید اس صدی کا مقدر تھی۔ وہ وقت کے گہرے سمندر میں خاموش بیٹھ گیا جیسے دنیا کی رنگینوں سے اس کا دل اُچاٹ ہو گیا ہو اور اس نے خواہشوں کی گردن مروڑ کر خود کو کنویں کی تنگ وتاریک دنیا کے حوالے کر دیا ہو۔ ویسے خواہشوں کا کیا۔ ایک فنکار کی نظر میں تو بس یہ ایک پھدکتی ہوئی چڑیا ہے۔ جس کبھی اس ڈالی پر تو کبھی اس ڈال پر...... لیکن وہ اسے بھی قید کرنا چاہتا تھا۔ بند چہار دیواری میں، بوسیدہ شیلف میں، ایک کرم خوردہ کتاب کی طرح۔

کل جب وہ بس میں سوار ہوا تھا تو اسے خدشہ تھا کہ کہیں سمت کی صحیح پہچان نہ کر سکا تو سوائے بھٹکنے کے اور کیا.......... اور ہوا بھی وہی۔ وہ پورب سے چل کر پورب کی طرف ہی لوٹ رہا تھا شاید بس ڈرائیور نے اپنے دوبارہ سفر کی تیاری کیلئے بس کا رخ پورب کی جانب موڑ رکھا تھا اور یہیں سے سمت پر اس کی گی گرفت ڈھیلی پڑگئی تھی اور قوت شناخت کمزور۔

پہچان کی قوت ہی تو انسان کو ذی ہوش رکھتی ہے جہاں یہ قوت کمزور پڑی کہ لوگ حواس باختہ بجھ کر اس پر چڑھ آتے اور پھر پتھروں کی بارش کو کون روک سکتا ہے۔

وہ جب بھی تنہا ہوتا اپنے اندر کی اتھاہ گہرائیوں کو ناپنے کی کوشش کرتا، اپنے اندر کے پوشیدہ کرب کو زبان پر لانے کی کوشش کرتا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی زبان گنگ ہو جاتی وہ ڈرتا کہ آج کے میشنی دور کا بچہ تو دودھ کی بجائے میشنی توانائی سے جوان ہو رہا ہے نئی صدی کی اس ہولناکی سے وہ سہم جاتا۔

اس دن جب اس نے بنگال کے اس انقلابی شہر سے خود کو بچا کر اس گاؤں کی سوندھی مٹی میں قدم رکھا تھا تو وہ کتنا مسرور تھا وہ تیز تیز سانس لینے لگا وہ کتنی فرحت بخش سانس تھی، شہر، وہ انقلابی واحتجاجی شہر، ہنگامے، سیاسی ومذہبی جلوسوں کے نعرے، ٹراموں کی گھڑ گھڑاہٹ، بسوں

کی دھول، گاڑیوں کے شوراور دن رات کی چک چک سے وہ اوب سا گیا تھا تب ہجرت کی ٹھانی۔ ہجرت جو پریشان کن صعبتوں پر شبنمی پھاہے کا کام کرتی ہے۔

اور پھر اس گاؤں کی سوندھی مٹی، ماں کی گود کی طرح اسے وشال نظر آئی جس کی شیتل چھایا میں وہ چین کی نیند سو پایا۔ وہ جانتا تھا کہ مقدر اب انسان کی ریکھاؤں میں محدود نہیں۔ جان توڑ محنت سے رگوں اور پٹھوں میں دوڑتے سرخ سرخ خون کے اتار چڑھاؤ نے ریکھاؤں کی دشائیں کو بدل ڈالا ہے قوت تسخیر ہی انسان کا اصل جوہر ہے۔

لیکن وہ ان سب سے بے نیاز اپنے وجود میں یوں گم ہونے کی کوشش کر رہا تھا جیسے معرفت مل گئی ہو...... وجود کا کیا......؟ اور اس کی حقیقت کیا! وہ تو ایک مادہ ہے تحلیل ہونا اس کا مقدر ہے سطح آب پر تیرتا رہے تو قائم ہے اور ڈوب جائے تو فنا...... فنا فی اللہ۔

سورج پورب سے نکل کر پچھم میں غروب ہو رہا تھا اس نے دیکھا انسان پورب سے طلوع ہونے والی حدت کے آگے گھٹنے ٹیکتا ہے تو غروب ہونے والے سرخی مائل کیفیت آگیں منظر کی برتری کو بھی تسلیم کرتا ہے۔

لیکن اپنی برتری ہر ایک کو مقدم ہے

افسوس! اسے علم نہیں سورج طلوع ہوتا ہی ہے غروب ہونے کیلئے۔ اگر غروب ہوگا تو پھر کل وہ طلوع کیوں کر ہوگا تو میں تباہ ہو کر مٹی میں مل جاتی ہیں اور اسی مٹی سے گوندھ کر وہ اینٹیں بناتا ہے انہیں اینٹوں سے متنازعہ کیفیتیں ابھرتی ہیں۔

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہو یا مندر، وہ ڈرتا ہے ان مندروں اور مسجدوں کے درمیان اینٹوں کی سجاوٹ ہے اور اینٹوں کے جسم میں مٹی کے گارے ہیں۔

مٹی کے گاروں میں انسانی جسم کی خوشبو۔

وہ انسانی جسم کے اس بو سے اچھی طرح واقف ہے کہ اس کا تعفن تو پوری صدی پر محیط ہے۔ انسانی جسم تو فانی ہے۔ زندہ مٹی کا تو وہ پل پڑھ کر خاکستر ہو جاتا ہے یہ سوچ اس کے ذہن میں

اب تک پیوست ہے راکھ اور خاک میں زیادہ فرق کہاں!
خاک ہی تو راکھ ہے اور راکھ ہی خاک۔ خاک ہی سے تو ہم بنے ہیں اور بگڑ کر بھی خاک ہی ہوں گے۔
وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سخت گیر لہجے میں کہتا ہے تم خاک کیوں جھاڑتے ہو خاک سے کب تک بچو گے، دیکھتے نہیں بچے خاک پر کھیل کر کتنے مسرور ہوتے ہیں ان بچوں کی مست آنکھوں کے خمار کا کیا کہنا۔
تب اس نے محسوس کیا گرد آلود کپڑے تو دھل جاتے ہیں لیکن گرد آلود اور گھائل روح!
ازل سے ابد تک جاری و ساری تو صرف روح ہے روح لافانی ہے روح کو موت آتی ہے کہاں؟

گوتمی علی

گوتمی علی

وہ بالکل برہنہ تھی

سر سے پاؤں تک ،ننگ دھڑنگ ،بغیر کپڑوں کے وہ اِدھر اُدھر دندناتی پھرتی ۔شرم وحیا کو وہ کسی شعلے میں جلا چکی تھی شعلے جس میں خوداس کی اپنی زندگی جل کر راکھ ہوگئی تھی شایداس نے راکھوں کو اکٹھا کر کے اپنی ایک مورت گڑھ لی تھی جس کی آنکھیں اب بھی بڑی بڑی اور سرخ تھیں مگر جسم بے شمار گردوغبار سے اٹا ہوا تھا اور چہرے پر منوں مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں ۔

مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی ،لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔خاموش رات کی طرح ،تماشائی بنا، چور نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا کہ کھلی آنکھوں سے دیکھنا تو ممکن نہ تھا۔لوگ کیا کہتے ؟میں کس کس کو سمجھاتا کہ مجھے اس نسوانی خدوخال سے کوئی دلچسپی نہیں ۔مجھے تو بس صرف اس کے اندر کے کرب سے سروکار ہے ویسے اس ہوس پرست دنیا میں انسان کی آنکھیں تو کپڑوں میں لپٹے جوان جسموں کو بھی برہنہ دیکھ لیتی ہیں ،۔

ہوٹل کے ریسونگ کاؤنٹر پر اونگھتے ہوئے اس شخص کو جو اب میرا دوست بن چکا تھا،ٹھوکا لگایا تو ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔

”کہئے !آپ کی کیا خدمت کی جائے ؟“اس نے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔

ارے بھائی۔تم میری خدمت سے اچھی واقف ہو۔ہفتوں سے میں تم سے صرف اس لڑکی

سے متعلق جانکاری چاہ رہا ہوں جو تمہارے ہوٹل کے صدر دروازے کے سامنے میلی کچیلی پڑی ہے۔''

سر! آپ اس پاگل، گندی لڑکی میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں کہئے تو میں شہر کی خوبصورت سے خوبصورت لڑکی کو حاضر کردوں آپ اس کا انٹرویو لے لیں'' اس نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا

''میرے بھائی...... مجھے تو اس پر ہی لکھنی ہے جو سماج اور معاشرے سے بالکل کٹ کر رہ گئی ہے'' میں نے تفصیل بتائی۔

''حضور، وہ سماج اور معاشرے سے کٹ کر معاشرے سے ہٹ کر اپنے غم اور غصے کا اظہار کر رہی ہے''

''میں اسی غم و غصے کی تہہ میں اترنا چاہتا ہوں'' میں نے کہا۔

''لیکن سر! وہ تو بالکل خاموش رہتی ہے کسی سے بھی کچھ نہیں بولتی'' اس نے جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر کہا۔

''وہ ایک بار کپڑوں میں تو آجائے میں اسے بولنا سکھا دوں گا۔ اس برہنگی کے عالم میں قریب جانا تو درکنار، آنکھیں بھی نہیں اٹھا سکتا'' میں نے اپنا ارادہ بتایا۔

''آپ کے مسلسل اصرار کے آگے میں مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کو اس کی تفصیل بتادوں ورنہ قسم کھائی تھی کہ کبھی کسی کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کون ہے اور کس شہر کی ہے؟'' ایک سانس میں وہ بول گیا۔ میں بھی پہلو بدل کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کہو، میرے بھائی کہو کہ میرے دل میں پڑی تجس کی پھانس ڈھیلی پڑ جائے''

''اس برہنہ، پاگل، حواس باختہ خاتون کا نام گوتمی علی ہے''

''گوتمی علی!'' میں چونکا

''ہاں حضور...... پہلے گوتمی شیوانی تھی پھر گوتمی علی بنی...... یہی تو اس کی زندگی کا المیہ ہے......''

گوتمی میرے ایک دوست کی امانت ہے شاید آپ کو یقین نہیں ہوگا کہ وہ جس نکڑ پر رہتی

ہے میں بھی وہیں کسی قریب کے ہوٹل لاج یا کسی دوکان کے کاؤنٹر پر کام کرتا رہتا ہوں اس کیلئے شہر شہر بھٹکتا رہتا ہوں، اس کے قریب تو نہیں جا سکتا دور سے ہی اس کی محافظت اپنی بساط بھر کرتا رہتا ہوں کہ اب اس کا کوئی یار و مدگار نہیں۔ اپنوں نے تو شرم سے آنکھیں ہی نہیں منہ بھی پھیر لیا ہے۔ کئی بار اڑوس پڑوس کی عورتوں کی مدد سے غسل کروایا، کپڑے پہنوائے...... مگر دوسرے ہی لمحے پھر وہی مادر زاد برہنہ نظر آتی۔ کپڑے بدن سے نوچ پھینکتی ہے۔ بنے سنورے بالوں کو نوچ نوچ کر بگاڑ لیتی ہے۔ شروع شروع میں تو احتجاجی نعرے بھی بلند کیا کر تی تھی اور بڑی فلسفیانہ باتیں بھی...... مگر اب خاموش، خاموش سی رہتی ہے صرف آنکھوں سے اپنے غم وغصے کا اظہار کرتی ہے"

"کیسے نعرے بلند کرتی تھی اور وہ فلسفیانہ باتیں کیا تھیں" میں نے بیچ میں ٹوک دیا۔

حضور، اس کے نعرے بھی عجیب ہوتے اور گفتگو بھی......" جب بھی کوئی کپڑے پہناتا تو وہ کپڑے پھاڑ دیتی اور چیختی ہوئی کہتی......

"ارے پاگلو...... کس کس کی ستر پوشی کروگے، یہاں تو سارا سماج برہنہ ہے سماج کا ہر فرد برہنہ ہے وہ دیکھو مولوی فضل الحق...... سر پر ٹوپی ہے مگر ٹانگیں ننگی اور جسم برہنہ۔ وہ دیکھو اُدھر...... پنڈت دیا شنکر اچاریہ جی نے بھی دھوتی کاندھے پر رکھ لی ہے ٹانگیں اور جسم برہنہ ہی رہ گیا نا۔ جاؤ اس ننگے سماج کے ننگے ٹھیکیداروں کو کپڑے پہناؤ۔"

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اب وہ کپڑے جسم پر رکھنا پسند نہیں کرتی جو کل تک کپڑے کی ملوں کی ملکہ کہلاتی تھی...... گوتمی مل مالک شیوانی جی کی اکلوتی بیٹی تھی روز نت نئے کپڑے زیب تن کر کے کالج آتی۔ بنی سنوری بالکل موم کی گڑیا لگتی۔

میں اسی کالج میں پڑھتا تھا کالج میں گوتمی کی خوبصورتی کے خوب چرچے تھے ساتھ میں نک چڑھی بھی کہلاتی تھی کہ کسی کو اپنے پاس بھٹکنے نہیں دیتی۔ اس کی خوبصورتی کے چرچے سن کر ہر کوئی اس کے قریب آنا چاہتا تھا لیکن وہ ہر کس و نا کس کو منہ نہیں لگاتی۔ ہمیشہ کار میں آتی، کلاس

کرتی اور پھر سیدھے کار میں جا بیٹھی۔

کالج میں میرا ایک بہت ہی عزیز دوست تھا احسن علی۔ بڑا مخلص تھا۔ تھا تو غریب گھر کا لیکن دل کا بڑا امیر تھا۔ شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ ہر وقت مسکراتا رہتا۔ گوتمی کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کی مسکان کے بھی چرچے تھے۔ بلا کا ذہن بھی پایا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ کالج کے ہر خاص و عام کا منظور نظر تھا۔ پھر کیا تھا سیاسی جماعت والوں کی نظر گڑ گئی اور یونین کے الیکشن کیلئے میدان میں اتار دیا۔

یہ اسی درمیان کی بات ہے کہ میں اور احسن علی، گوتمی سے اپنی حمایت چاہنے اور ووٹ مانگنے چلا گیا۔ گوتمی برجستہ بول اٹھی۔

'' آپ لوگ منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ ووٹ کوئی بھیک مانگنے کی چیز نہیں جو مانگی جائے یہ تو دینے کی چیز ہے مانگ کر اسے چیپ (Cheap) سستی نہ بنائیں''

'' واہ کیا اچھے خیالات ہیں آپ کے۔ واقعی میں لاجواب ہو گیا'' احسن نے کہا۔

اس پر گوتمی بولی...... '' جائیے، اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیجئے، اپنی نیک نیتی اور اپنے بلند و معیاری کردار کو نمایاں کیجئے اور ووٹ بھیک کی طرح کسی سے مت مانگئے۔ یہ کم ظرف لوگ کرتے ہیں بھیک کی جھولی پھیلا کر، غربت کا ڈھونگ رچا کر، مفلسی کی درد بھری کہانی سنا کر بھولے بھالے عوام کو لوٹ لیتے ہیں آپ کم از کم ایسا مت کیجئے کہ آپ کی اعلیٰ ذہانت کی میں بھی قدرداں ہوں اسے بھگوان کیلئے زخمی ہونے مت دیجئے''

'' اور پھر احسن نے کاغذی پروپیگنڈے پر ہی قناعت کر لی۔ کسی بھی لڑکے یا لڑکی کے آگے ووٹ کی بھیک نہیں مانگی بلکہ صرف طالب علموں کی ضرورتوں، کالج کمیٹی کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں، انتظامیہ کی سستیوں کو ہی اُجاگر کرتا رہا...... اور نتیجہ آپ کو یقین ہو گا''

اس نے لمحے بھر کیلئے ٹھہر کر پوچھا۔

'' ہاں...... ہار گئے ہوں گے۔ یقیناً ہار گئے ہوں گے'' میں نے وثوق کے ساتھ نتیجے کا

اعلان کر دیا۔

''نہیں...... میرے بھائی، ہم لوگ شاندار طور پر جیت گئے تھے۔''

تب گوتمی خود آ کر ملی اور احسن کو اس کی بے مثال کامیابی پر مبارک باد دی۔ احسن گرم جوشی گھنٹوں اس کے نرم نرم ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لئے اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہا۔ اپنی کامیابی کو اس کی کامیابی بتاتا رہا۔

اس طرح گوتمی، احسن علی کے قریب سے قریب آتی چلی گئی اور احسن علی بھی اس کی طرف سمٹتا چلا گیا۔ پھر کیا تھا کوئی بھی محفل ہو۔ چاہے مشاعرے کا اہتمام ہو یا سرسوتی پوجا کا پروگرام ، ہم تینوں ہی تقریب کے روح رواں ہوتے۔

گوتمی کی آزادخیالی پر ہم لوگ دنگ رہ جاتے...... بغیر تفریق مہذب وملت وہ ہم دونوں کی دسترخوان پر بیٹھ جاتی اور بلا جھجک فرمائشی ڈش منگواتی اور بغیر کسی تلکلف کے گھنٹوں ہم دونوں کے درمیان بیٹھی رہتی اور موجودہ صورت حال پر بے لاگ تبصرہ کرتی۔ وہ مذہبی دیوانگی کی قائل نہ تھی۔

احسن سے اس کی دلچسپی کچھ زیادہ ہی تھی اکثر وہ اس کے گھر جاتی۔ احسن کی ماں کی دعائیں لے کر وہ بہت خوش ہوتی۔ کہتی میری ماں بچپن میں ہی مجھے چھوڑ کر بھگوان کو پیاری ہوگئی۔ بھگوان بھی کیا چیز ہے کہتے ہیں وہ سبھوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہے لیکن کتنے لوگ ہیں جن کی تمام ضرورتیں پوری ہوئی ہیں بھگوان کے انصاف پر گھنٹوں منفی خیالات کا اظہار کرتی رہتی۔ احسن سمجھاتا تو کہتی۔

''آپ تو مسلمان ہیں نا، خدا کو ہی اول وآخر سمجھتے ہیں''

تب احسن بھی اپنی بیزاری کا اظہار کرتا اور اپنے وسیلہ خدا سے ناراضگی کی وجہ بتاتا۔

''نہیں گوتمی، میں بھی اپنے مالک سے خوش نہیں۔ کہتے ہیں غریبوں کے یہاں خدا بستا ہے لیکن جس کے گھر سارے جہاں کا مالک موجود ہو، وہ کوڑی کوڑی کا محتاج رہے اپنی بے کیف زندگی کو کہاں تک بیان کروں انسان کتنا مجبور اور بے بس ہے ڈر اور خوف

میں جیتا رہتا ہے کہ کہیں اللہ خفا نہ ہو جائے ، یہ کرو...... یہ مت کرو...... اس سے بھگوان ناراض ہوگا اس سے خدا خوش نہیں"

اس طرح دونوں کی مذہبی بیزاری اور آزادخیالی نے ایک دوسرے کو اور قریب کر دیا۔ میں بیچ بچاؤ کا پہلو ڈھونڈ تا رہتا کہ میرے لئے دونوں عزیز تھے احسن میری رگ جاں میں سما چکا تھا اور گوتمی تو میرے احسن کی امانت تھی کیوں نہ عزیز ہوتی کہ اصل سے زیادہ سود پیارا ہوتا ہے اپنا کیا تھا۔ نہ ماں تھی نہ باپ۔ یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا۔ اناتھ ہی مر جاتا تھا لیکن یہ دونوں خوش رہیں یہی میری خواہش تھی یہ سوچ کر ان دونوں کو قریب سے قریب تر لانے میں اہم رول ادا کرتا رہا اور قاصد بن کر ایک دوسرے کو ملنے ملانے میں لگا رہتا۔

احسن کی ماں کو شروع شروع میں تو اعتراض ہوا کہ گوتمی ہندو تھی لیکن احسن نے مذہبی دیوار کو مٹی کے گھروندے کی طرح منٹوں میں یہ کہکر ڈھا دیا کہ......

"یہ مذہبی دیوانگی مجھے پسند نہیں کہ گوتمی ہندو ہونے کی وجہ سے میری شریک حیات نہیں بن سکتی تو ٹھیک ہے میں ہندو بن کر گوتمی کا تو ہو سکتا ہوں"

ماں سہم گئی اس نے ناراض بیٹے کے سر پر شفقت کا آنچل رکھ دیا اور پھر خود اپنے خدا کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر گھنٹوں اپنے بیٹے کے گستاخانہ رویوں کی معافی چاہتی رہی۔

لیکن گوتمی کے پتا کو یہ منظور نہ تھا کہ اس کی بیٹی مسلمان کے گھر بیاہی جائے یوں تو تقسیم ہند کے بعد ہندو کے مسلم معاشرتی طور پر صرف دکھاوے کے ایک تھے ورنہ اندر ہی اندر دونوں دو مختلف دشاؤں کی طرح بٹے تھے اور گوتمی کے پتا شیوانی کا زخم تو ہرا ہی تھا۔ تقسیم ہند نے ہی اس کے اور اس چھوٹے بھائی کے درمیان حدفاصل کھینچ دی تھی اور اب بھی وہ سندھ میں مہاجر کی حیثیت سے جی رہا تھا اس کی کسمپرسی کی حالت انہیں اکثر سننے کو ملتی۔ شیوانی جی نے کئی بار چاہا کہ اسے یہاں بلوالیں لیکن چھوٹے کی ضد تھی کہ اس سندھ میں ہی ایک دن اپنا پرچم لہرائے گا۔ وہ سندھی تحریک سے منسلک تھا۔ شیوانی جی کے اندر اپنے چھوٹے بھائی کے اوپر مہاجر کا شبہ ناسور

کی طرح بڑھ رہا تھا کہ اسے وہ مسلم نوازوں کی کارستانی سمجھتے تھے شاید اسی لئے وہ کبھی بھی مسلمان گھرانوں سے نباہ کی گنجائش پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

احسن علی ذہین اور تیز تو تھا ہی اس نے اپنی سچی لگن سے کالج کے امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کر کے اپنی شہرت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ گوتمی خوش تھی کہ اس کا نام بھی تو اسی سے جڑا تھا لیکن گوتمی کے پتا شیوانی جی کو یہ گوارا نہ تھا کہ گوتمی کا نام اس سے جوڑا جائے انہوں نے دونوں کے درمیان لکشمن ریکھا کھینچ دی اور گوتمی کو سختی سے تاکید کر دی کہ آئندہ کبھی بھی احسن کے قریب نہ بھٹکے۔

لیکن گوتمی خود کو الگ خانے میں کس طرح رکھ سکتی تھی کہ اس کی کوکھ میں احسن کا بچہ پل بڑھ رہا تھا۔ شیوانی کی حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب انہیں یہ علم ہوا کہ گوتمی نے نہ صرف اپنی مرضی سے احسن سے سول میرج کر لی ہے بلکہ کوکھ میں احسن کے بچے کو بھی پال رہی ہے۔

وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

اور پھر شیوانی جی کے غم و غصے کی گونج ساری فضا میں پھیل گئی۔ فضا ابر آلود ہو گئی۔ شیوانی جی کی گرج اور ابر کی گونج سے فضا مکدر ہو گئی۔ چاروں سمت زور کی بارش ہوئی۔

ہفتوں مینہ برستا رہا کہ دھرتی کے پتر شیوانی جی پر حکمرانی کا جوش تھا اور شہر کے مجسٹریٹ کی تربت نے شیوانی جی کو خدائی دعویداروں کی صف میں لا کھڑا کر دیا تھا۔

مجسٹریٹ صاحب سے شیوانی جی کی خوب بنتی تھی دونوں یارانہ تھا اور پھر دونوں نے مل کر قانون کی جڑیں تک ہلا کر رکھ دیں۔ احسن کی محبت کو مسلمانوں کی گندی سیاست کا رنگ دے کر سارے شہر میں کہرام مچا دیا۔ پھر کیا تھا ہندوتو کی لہر پھیل گئی۔ فرد واحد کی حرکت کو قومی دھارے کی اور موڑ دیا گیا اور جبر و قہر کی انتہا کر دی گئی۔

شہر کے اس حلقے کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ جہاں احسن علی اپنی غریب ماں کے ساتھ رہا کرتا تھا، پورے علاقے میں مجسٹریٹ صاحب کے نافذ کردہ کرفیو نے وہ رنگ دکھایا کہ امبیڈکر سیکولر قانونی ڈھانچہ منٹوں میں خاکستر ہو گیا اور اس کے ملبے تلے دب کر احسن علی

بھی ہلاک ہو گیا۔

شیوانی جی خوش تھے کہ انہوں نے اپنی بیٹی پر احسن کے ظلم کا ازالہ پوری قوم سے مع سود وصول کر لیا تھا تب گوتمی علی چیخ اٹھی ...... اور پتا کے سفید دامن کو کھینچ کر بولی۔

''آپ احسن اور اس کے مٹھی بھر حامیوں کو جلا کر سوچتے ہیں کہ پوری قوم کو ختم کر دیا ...... نہیں پاپا نہیں ...... اس نسل کا ایک بچہ میری کوکھ میں بھی پل رہا ہے اور وہ آپ کی اس ظالمانہ حاکمیت پر ایک دن ضرور کاری ضرب لگائے گا۔ وہ اپنے پاپا کی موت کا بدلہ آپ سے ضرور لے گا۔''

''رہے گا تب نا بیٹی'' میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا''

اور پھر وہ لاکھ چیختی چلاتی رہی اس کا ابورشن (Abortion) کروا دیا گیا۔ وہ ہاسپٹل میں نیم بے ہوشی کے عالم میں احسن، احسن ہی پکارے جا رہی تھی۔ جب پوری طرح ہوش آیا تو وہ پاگل ہو اٹھی۔ اپنے پاپا کی اس ظالمانہ حرکت پر وہ اپنے حواس کھو بیٹھی اور پھر اپنے ہی جسم کو نوچتی، کھسوٹتی، چیختی چلاتی، کپڑے پھاڑتی باہر سڑک پر نکل آئی۔

اس وقت سے آج تک جسم پر کپڑے نہیں رکھتی۔ کہتی ہے کہ جب سارا سماج برہنہ ہو تو اس مٹی کے تودے پر کپڑے رکھنے سے کیا فائدہ اور پھر مجسٹریٹ صاحب ہوں یا شیوانی جی سبھوں پر گالیوں کی بوچھار کرتی رہتی ...... اتنی بوچھار کرتی رہی کہ ایک وقت اس کی زبان گنگ ہو گئی اور اب تو صرف آنکھوں سے ہی اپنی نفرت کا اظہار کر پاتی ہے۔

اس روز جب میری آنکھ کھلی تو سامنے ہوٹل کے ریسونگ کاؤنٹر کا وہ شخص کھڑا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق رات گئے گوتمی علی کی موت ہو گئی تھی۔ گاندھی چوک پر کپڑوں میں لپٹی گوتمی علی کی لاش پڑی تھی۔ چاروں اور لوگوں کا مجمع ساتھ بچے بوڑھے، جوان، ہندو، مسلم بھی موجود تھے سرہانے شیوانی جی بھی اپنے کارندوں کے ساتھ موجود تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ یکا یک لاش میں حرکت ہوئی اور پھر گوتمی علی کفن پھاڑ کر ننگی دھڑنگی باہر نکل آئی اور شیوانی کی تیار کردہ صندل کی سیج پر برہنہ ہی لیٹ گئی۔

برف میں چنگاری
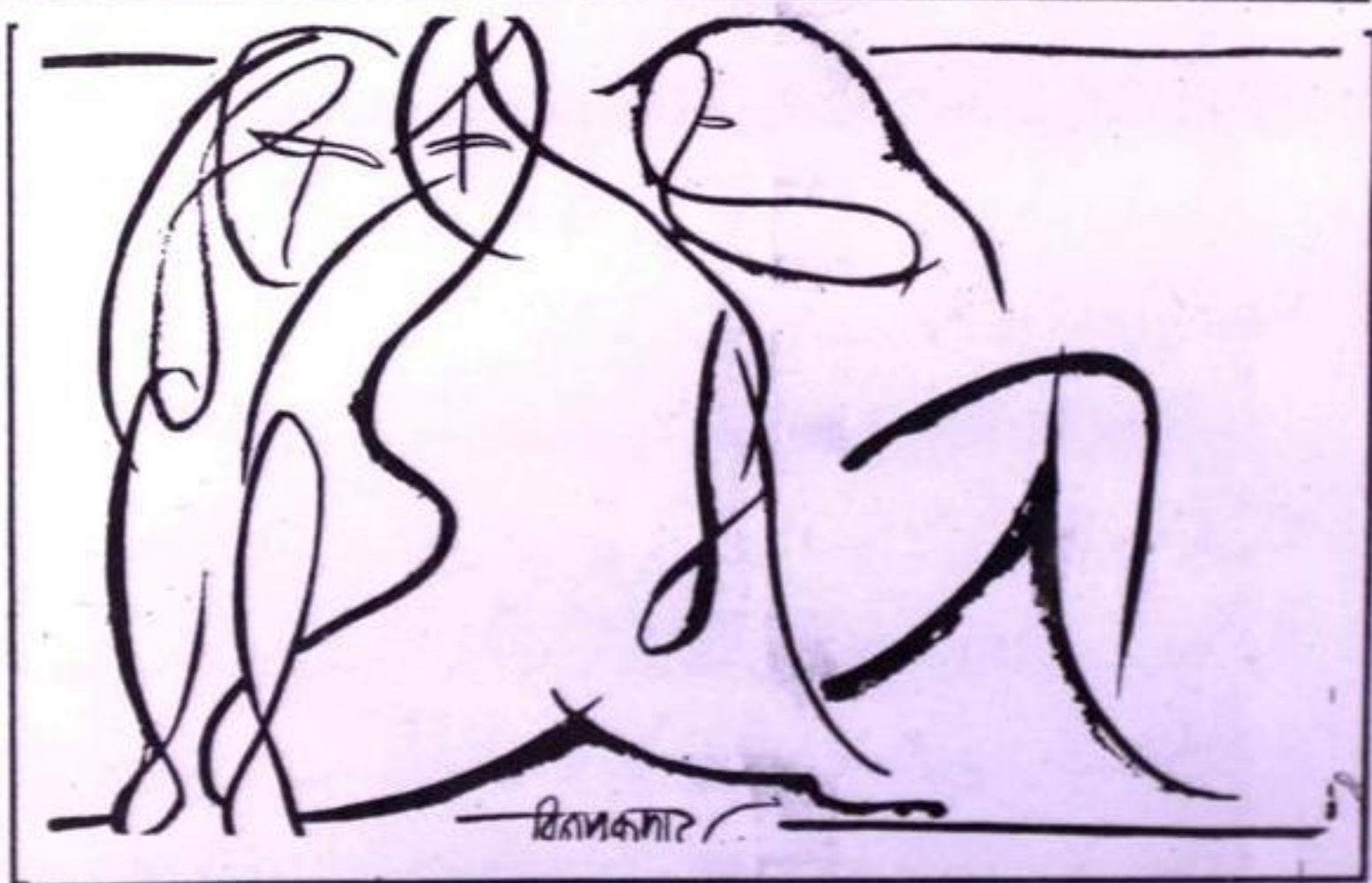
برف میں چنگاری

راجیش کی موت کے بعد سلیکھا نے خود کو ایک دائرے میں مقید کر لیا تھا جہاں امنگوں کے حسین پرندوں کی پرواز ممکن نہ تھی۔ سلیکھا کو زندگی بے ثمر نظر آ رہی تھی شاید اسی لئے سلیکھا اپنی زندگی کے سنہرے اوراق کو مٹی کی سات تہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن کر دینا چاہا تھا کہ اب وہ خاموش زندگی جینا چاہتی تھی لیکن دینش کی بے جا دلچسپی سے وہ اعقل پتھل ہو کر رہ جاتی۔ سلیکھا اس کی خمار آلود آنکھوں سے گھبرا جاتی۔

دینش یوں تو راجیش کا چھوٹا بھائی تھا لیکن عادت اور فطرت میں وہ راجیش سے بالکل مختلف تھا شاید یہی وجہ تھی کہ سلیکھا اس سے کتراتی کہ دینش ہمیشہ اس کے شوخ اور گلنار بدن کو ننگی آنکھوں سے نہارتا رہتا۔ سلیکھا اس کے تیر نم کش سے گھبرا کر خود میں سمیٹ آتی تھی۔

سلیکھا اب اپنا زیادہ تر وقت موتی کی دیکھ ریکھ میں گزارتی۔ اسے خود نہلاتی، دھلاتی اور اپنے ہاتھوں سے اسے دودھ پلاتی۔ سفید روئیں دار ملائم، نرم و گداز موتی کو ہمیشہ اپنے سے چمٹائے رکھتی۔ موتی کی گول گول چمکیلی آنکھوں کی چمک سلیکھا کو بھلی لگتی،۔ جب ان آنکھوں میں شرارت دیکھتی تو سلیکھا تفریح کیلئے اسے کھلے میدان میں ساتھ لے جاتی۔ گلے میں مخملی پٹہ اور پٹے سے جڑی زنجیر ہمیشہ سلیکھا کے ہاتھوں میں جھولتی رہتی۔ شوپنگ یا تفریح کیلئے بھی

نکلتی تو موتی ساتھ ہوتا۔

جب کبھی وہ موتی سے الگ تنہا ہوتی، ماضی اسے آ دبوچتا۔ وہ ماضی کے دھند لکے میں اتر جاتی۔ ایسا لگتا کہ راجیش اسے اپنی بانہوں میں سمیٹے دور چاہت کی وادیوں میں اترتا چلا جارہا ہے راجیش اس کے کندن جیسے بدن سے سپیرے کی طرح بین بجارہا ہے اس کے نرم، ملائم اور چکنے گلابی گال کے قریب، اپنے نتھنے پھلائے گرم گرم سانس لے رہا ہے اس وقت اس کا بدن توے کی طرح تپ جاتا اور پھر سارا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور نبض ڈوبنے لگتی۔ ایسی صورت میں وہ گھبرا کر بھاگتی اور سیدھے باتھ روم میں جا دبکتی جہاں گھنٹوں ٹھنڈے پانی میں نہاتی رہتی پھر باہر آتی اور رحمان چاچا کا دیا ہوا کاغذی نسخہ پانی میں گھول کر غٹا غٹ ایک سانس میں پی جاتی تب جاکر کہیں خود پر قابو پاتی۔

راجیش سے اس کی پہلی ملاقات انٹر کالج ڈی بیٹ کمپٹیشن میں ہوئی تھی بڑی بڑی آنکھیں، پروقار چہرہ۔ چہرے پر سنجیدگی کی چھاپ لئے موٹی تہہ دار مونچھیں اور اس پر ابھرتا ہوا قد...... وہ تھوڑی دیر کیلئے اپنے مقابل کھڑے راجیش سے گھبرا گئی تھی لیکن موضوع پر بھرپور گرفت اور زبان کی سلاست نے آخر کار راجیش کو پچھاڑ ہی دیا تھا۔

راجیش کو اپنی شکست پر ذرہ برابر بھی ملال نہ ہوا کہ حق بحق دار رسید پر وہ نازاں تھا اور اپنی جھینپ مٹانے خود ہی سلیکھا کو اس کی کامیابی پر مبارک باد دینے چلا آیا۔

''ویسے آپ انگریزی کافی روانی سے بول لیتی ہیں'' راجیش نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''کونونٹ کی پڑھی ہوں'' سلیکھا بھی کچھ شرماتی ہوئی بولی۔

''یہی وجہ ہے کہ میں چاروں شانے چت گر گیا...... ورنہ اچھے اچھوں کی میں منٹوں میں چھٹی کر دیتا ہوں'' راجیش نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا۔

''ہاں! پہلے پہل تو میں بھی گھبرا گئی تھی لیکن آپ کو نروس دیکھ کر حوصلہ بڑھ گیا۔

سلیکھا بھی اے فرسٹ ایئر کی نو وارد طالبہ تھی۔ وہ ومنس کالج کی اور راجیش شہر کے

معروف جی سی کالج کا فائنل ایئر کا ایک تیز وطرار اسٹوڈنٹ تھا ڈی بیٹ کا بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا۔ اپنے مخالف پر چند الجھے اور پیچیدہ نقطے پیش کر کے ہمیشہ بازی لے جاتا لیکن آج سلیکھا کی روپ ریکھا میں کچھ اس طرح الجھ کر رہ گیا تھا کہ اپنی گتھی خود نہ سلجھا پایا۔

تری سلیکھا بڑے باپ کی بیٹی تھی نازوں میں پلی تھی اس لئے طبعیت کی ذرا ضدی تھی لیکن دل کی کومل تھی پتھر بھی دل میں اتر ائے تو دیوتا مان لیتی اور راجیش تو بہر صورت جیتا جاگتا انسان تھا۔

راجیش اور سلیکھا کی گرفت ایک دوسرے پر اتنی مضبوط ہوتی گئی کہ سات پھیرے پلک جھپکتے پورے ہو گئے۔ سلیکھا راجیش کو جیون ساتھی بنا کر بہت خوش تھی اور راجیش بھی خوش تھا کہ جس کے ہاتھوں شکست کھائی تھی اسی کو جیت لایا تھا دونوں خوش تھے زندگی کے محور پر دونوں پہیئے گھوم ہی رہے تھے کہ اچانک ایک دن پہیئے کا کوئی بولٹ ڈھیلا پڑ گیا اور پھر زندگی ہی لڑھک گئی۔

اس دن شادی کی دوسری سالگرہ تھی۔ گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ راجیش حسب معمول سلیکھا کو اپنے ہاتھوں سنوار رہا تھا۔ ماتھے کی بندیا، بالوں میں گجرے، ہاتھوں میں کنگن اور پھر ہونٹوں پر لب اسٹک کی جگہ اس نے اپنے گرم گرم ہونٹ ثبت کر دیئے۔ پہلے تو سلیکھا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی پھر دونوں بازو پھیلائے تقریباً راجیش کو دبوچ ہی لیا۔

اس رات کے بعد اس طرح پھر وہ کبھی نہیں بچ سکی کہ دوسرے یا تیسرے دن ہی راجیش کو دل کا دورہ پڑا اور پھر وہ ہمیشہ کیلئے سلیکھا کو سسکیوں کی دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا اس کی خبر جب سلیکھا کو ملی تو وہ نیم جان سی ہو گئی۔

وہ تو بھلا ہو کہ اس وقت رحمان چاچا موجود تھے۔ رحمان چاچا مجسٹریٹ صاحب کے گہرے دوست تھے بچپن سے جوانی اور اب بوڑھاپا ساتھ ساتھ گزار رہے تھے عرصہ تک پڑوس میں ہی رہے لیکن فی الوقت اپنے بڑے لڑکے کیساتھ ریلوے کالونی میں رہ رہے تھے۔ پشتینی

مکان کو بچی کی شادی میں فروخت کر دیا تھا۔ فرصت یا تقریب کے موقع پر مجسٹریٹ صاحب سے ملنے چلے آتے۔ گھر کے سبھی لوگ ان کی عزت کرتے۔ عالم تھے عالم۔ مجسٹریٹ صاحب بھی ان کے علم کی قدر کرتے تھے۔

سلیکھا اپنے آپ میں گم رہنا چاہتی اس لئے سارا وقت موتی کی خدمت میں لگی رہتی اور اب تو موتی بھی سلیکھا سے مانوس ہو گیا تھا اس کے اشارے پر ہی سر دھنتا، سلیکھا کی تربیت سے وہ بالکل سدھ گیا تھا۔

برسات کا موسم تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی سبھی اپنی جگہ سمٹے بیٹھے تھے لیکن موتی بے چین تھا کبھی وہ جنگلے کی طرف بھاگتا تو کبھی صدر دروازے کی طرف لپکتا۔ چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی لال تھیں اور زبان گز بھر باہر نکل آئی تھی وقفے وقفے سے موتی کبھی اپنے جسم کو سنکتا اور کبھی دور دیوار کو، سلیکھا اس حرکت سے پریشان ہو گئی فوراً ڈاکٹر کو بلوایا۔ جانور کے ڈاکٹر نے کافی دیر تک موتی کا معائنہ کیا۔ پہلے روئیں دار جسم کو ٹٹولا پھر ٹانگوں کو آگے پیچھے کر کے دیکھا، منہ کے جبڑے کو چیر کر دیکھا اور کہا۔

ویسے تو آپ نے وش کے دانت نکلوا دیئے ہیں اور ناخن بھی برابر کٹے ہوئے ہیں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل یہ سن بلوغیت کی کیفیت سے دوچار ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں نے سوئی لگا دی ہے آپ اطمینان رکھیں"

ڈاکٹر تو اطمینان دلا کر چلا گیا لیکن سلیکھا کافی پریشان رہی۔ ادھر مجسٹریٹ صاحب بھی زیادہ اداس رہنے لگے تھے۔ راجیش کی بے وقت موت سے وہ ٹوٹ سے گئے تھے۔ ہر وقت سلیکھا کے مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ کم عمر بہو کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھتے اور پھر دنیش کی اوباش طبعیت کو دیکھکر وہ سہم سے جاتے کہ دنیش پر ان کی گرفت کمزور تھی۔ اس دن وہ ایک مضبوط ارادے کے ساتھ سلیکھا کے کمرے میں آئے اور نہایت شفقت سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''بیٹی سلیکھا...... غم اور غصہ وقتی ہوا کرتے ہیں۔ حالات کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ بیٹی، میں تمہیں ایک دن بہو بنا کر لایا تھا آج چاہتا ہوں بیٹی بنا کر بیاہ دوں''

تب سلیکھا زاروقطار رونے لگی اور ایک فریادی کی صورت ہاتھ جوڑ کے کہنے لگی۔

''پاپا، آپ میرے پتا ضرور ہیں لیکن مجھے بیٹی نہ بنایئے کہ بیٹی کا مقدر تو ایک دن میکے چھوڑنا ہی ہوتا ہے بھگوان کیلئے مجھے آپ بہو ہی بنائے رکھئے کہ میں راجیش کو اپنے آپ سے کبھی الگ نہیں کر سکتی۔ میرے روم روم میں وہ بسے ہیں۔ میں اپنے آپ پر کسی اور کا سایہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ پلیز پاپا...... اس بڑے سے کشادہ مکان کا ایک کونا مجھے دے دیجئے۔ میں ان کی یاد میں جی لوں گی۔''

مجسٹریٹ صاحب بھی لرز اٹھے اور سلیکھا کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''نہیں بیٹی ایسی بات نہیں.......... میں تو اپنی ذمہ داری سے ڈرتا ہوں عمر کے آخری سرے پر کھڑا ہوں کب لڑھک جاؤں ٹھیک نہیں اور پھر دینش کی لاابالی طبعیت سے گھبراتا ہوں''

اس روز جب وہ گھر لوٹی رات کافی ہو چکی تھی وہ جس وقت گھر سے نکلی تھی آسمان بالکل صاف تھا لیکن جیسے ہی وہ اپنی سہیلی کے یہاں پہنچی۔ بادل چاروں طرف سے گھر آے اور پھر جو بارش شروع ہوئی تو رکی نہیں حالانکہ وہ زیادہ دور نہیں نکلی تھی ورنہ کار ضرور لے لیتی ویسے تو وہ جلدی باہر نہیں نکلتی لیکن آج راجیش کی یاد کچھ زیادہ ہی ستا رہی تھی سوچا کہ سہیلی سے مل کر غم بانٹ لیں گے اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے خود کو بہلا لے گی لیکن انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے دو تین گھنٹے تک کسی سہیلی کے یہاں بیٹھے رہنا اسے گراں گزر رہا تھا مجبوراً سہیلی کی چھتری لے کر چل پڑی۔

چھتری سر کو ڈھانپ سکتی ہے شریر کو نہیں اور جوان جسم بھیگ جائے تو اس کے اندر چنگاریاں اٹھنے لگتی ہیں اس کا احساس اسے بھیگے ہوئے کپڑے اتارتے ہوئے ہوا۔ وہ نائٹ گون پہن کر برآمدے میں کافی دیر تک ٹہلتی رہی۔ ٹہلتے ہوئے اسے کئی بار ایسا لگا جیسے راجیش

باہیں پھیلائے اسے اپنی گرفت میں لینے کو بے چین ہو۔ تب اس کا انگ انگ دکھنے لگا۔ کسے کسائے جسم میں سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ اندر ہی اندر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا اور پھر جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔

اس وقت وہ اس کیفیت سے گھبرا کر اوندھے منہ، تکیے میں اپنا چہرہ چھپائے خود میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں کب اسے نیند آ گئی۔

رات کا کوئی آخری پہر ہوگا کہ اسکی نیند ٹوٹ گئی اس نے محسوس کیا کہ اس کے کپڑے بے ترتیب ادھر اُدھر پڑے ہیں اور ادھ کھلے ننگے جسم پر موتی سینہ تانے، اپنے دونوں پنجے اس کے سینے پر گڑائے، اس پر غرا رہا ہے۔

پہلے تو سلیکھا جھنجھلائی، پھر چیخی...... ''موتی، ہٹو، ...... یہ کیا بدتمیزی ہے''

لیکن موتی بدستور اپنی جگہ پر کھڑا، منہ سے رال ٹپکائے جا رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا اور آنکھیں بھی لال تھیں۔ سلیکھا اس کے پنجوں تلے دبی بے بس ہی ہو جاتی کہ اچانک اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ موتی کو اپنے اوپر سے الگ کرتے ہوئے اسے دور پھینکا اور پھر دراز سے ریوالور نکال کر بڑبڑائی۔

''جانور، تو جانور ہی رہے گا۔ تجھے ان چھاتیوں سے نہ سہی ان ہاتھوں سے تو دودھ پلایا ہے''

اور پھر تڑا تڑ ایک، دو، تین گولیاں داغ دیں۔

گولیوں کی آواز سے دینش کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ نائٹ گوؤن پہنے باہر نکل آیا۔ سلیکھا کے کمرے کے قریب آ کر وہ رک گیا۔ زخمی موتی کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ دینش کو، موتی کی لاش دیکھکر ایسا لگا جیسے اس کا اپنا جسم گولیوں سے چھلنی پڑا ہے۔

ننگی آنکھوں کا منظر

ننگی آنکھوں کا منظر

گودھرا واقعے کے بعد پورے گجرات کے ہنگامے کی خبریں سرخیوں میں چھپی تھیں۔ میں ترقی یافتہ دور کی اس جابرانہ اور ظالمانہ حرکتوں پر حیران تھا کہ سماعت سے معلن کی آواز ٹکرائی......

"نہایت ہی افسوس کے ساتھ یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ......فلاں صاحب کی والدہ اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئیں۔ بعد نماز عشاء......فلاں قبرستان میں سپرد خاک کی جائیں گی۔آپ حضرات شریک نماز جنازہ ہو کر ثواب دارین حاصل کریں"

یہ اعلان سن کر ششدر رہ گیا.........کیا میری والدہ کا ایک بار پھر انتقال ہو گیا......
موت تو ایک بار آتی ہے!.........یہ بار بار مرنا کیسا؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں پہلی بار اپنی پیدائش کے ایک سال بعد ہی اپنی والدہ کی موت سے دوچار ہوا تھا۔ یہ ۱۹۴۷ کے آس پاس کی بات ہے۔ چاروں اور شور و ہنگامہ برپا تھا فلک شگاف نعرے انگارے برسا رہے تھے۔ میں اپنی ماں کی گود میں دبکا بیٹھا تھا۔ ٹھیک گو د نہیں کہیں گے کہ میں تو اس وقت ماں کی چھاتی سے چمٹا دودھ چوس رہا تھا۔ شیرنیت اور نمکینیت سے ذرا الگ تھلگ اس کا ذائقہ تھا کہ اچانک ماں کی چھاتی سے دودھ کا رسنا بند ہو گیا۔ میں بلک بلک

اٹھا .... دھاڑیں مار کر رونے کی خواہش تھی مگر منہ بسور کر ہی رہ گیا۔

دیکھتے دیکھتے گھر باہر لوگوں کا ہجوم سا لگ گیا۔ معصوم بچے کو بے سہارا دیکھکر سبھوں کی آنکھیں بھر آئیں ۔ میرے مغموم چہرے کو دادی اماں نے آگے بڑھ کر اپنے آنچل میں چھپا لیا تھا۔ لیکن میری ننگی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

ماں کو پہلے غسل دیا گیا پھر کافور کا چھڑکاؤ ہوا۔ تب ماں کو سفید کپڑوں میں لپیٹ کر منوں مٹی کے نیچے اتار دیا گیا۔ میری نحیف وکمزور آنکھوں میں آنسو کم حیرت زیادہ تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میری ماں کی نہیں بلکہ میری ننھی سی جان کی موت ہوگئی ہو۔

میری ننھی شرارتوں، معصوم امنگوں اور بے جا خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا گیا کہ اس وقت سے نہ معلوم کب تک میں نے امنگوں ار خواہشوں کی ننھی ننھی چڑیوں کو اپنے آنگن میں پھدکتے نہیں دیکھا۔ میرے نونہال ونحیف کاندھے پر مصائب وآلام ۔ رنج وغم ۔ فکر وتردد کا انبار سا لگ گیا تھا۔

میں اداسی، مایوسی، یاس اور بے انتہا کرب ودرد کی خاردار آغوش میں پل بڑھ کر جواں ہوا۔ جہاں نرم وگداز پھولوں کی سیج کا تصور بھی گناہ تھا۔ مایوسی، ناامید اور بے قراری ہی میری زندگی کی حاصل رہیں .... جوانی آتے ہی ذمہ داری کے احساس سے میں ٹوٹ سا گیا۔ والد محترم کی سخت محنت اور قلیل آمدنی اور بھائی بہنوں سے بھرا گھر .... میری آنکھوں میں پریشانی اتر آئی۔

بس ذرا سی راحت ملتی تھی تو وہ دوستوں اور احبابوں کی بے تکلف محفل تھی جہاں بیٹھ کر پل دو پل ہنس بول کر جی بہلا لیتا تھا...... لیکن وہاں بھی کبھی کبھی عجیب سے بے چینی اُمڈ آتی .... سچ ہے اندر کے کرب کو چھپا کر ہنس بول لینا بھی ایک فن ہے جس پر میں پوری طرح اتر نہیں پا رہا تھا۔

”ارے یار...... تو ہر وقت کس سوچ میں ڈوبا رہتا ہے“ بہت قریب بیٹھے ہوئے دوست نے

ٹھوکا لگا یا۔

''سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر، خود کو تلاش کرتا ہوں'' میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''بھائی میرے، تیری یہ فلسفیانہ باتیں، میری سمجھ سے بعید ہیں'' دوست نے قدرے خفگی سے کہا۔

''تم نے کبھی آئینے میں خود کو دیکھا ہے سوچ فکر سے ادھا ہو کر رہ گیا ہے'' دور بیٹھے مخلص دوست نے ہمدردی کا پاہار کھتے ہوئے کہا۔

''یہ جسم و جان کی تو فنا ہونا ہی ہے۔ وہ میں قسطوں میں ہو رہا ہوں'' میں نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایسا سوچنا کفر ہے'' ایک مولوی صورت دوست نے آگے بڑھ کر بولا۔

میں ان لوگوں کو کیسے سمجھاتا کہ میں سرکس کا کوئی جوکر تو ہوں نہیں کہ ماں کی موت پہ بھی مسکراتا رہوں، لوگوں کو ہنساتا رہوں۔ دوستوں سے اپنی مایوسی، بے رس زندگی کا نوحہ کیا یہاں کرتا۔ یہاں تو زندگی...... بے ثمر، غیر آسودہ۔ آرزؤں اور تمناؤں کی المیہ بن کر رہ گئی تھی۔

اس دن کالج میں بھی سارا دن اداس اداس سا رہا۔ اداسی اسر مایوسی شاید میرا مقدر بن گئی تھی۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ خوشی آدھمکی۔ خوشی کالج کی نو منتخب جی ایس تھی، بڑی بڑی بلبول جیسی آنکھیں۔ لمبے گھنے گھٹنے تک جھولتے بال، سنولی رنگت، لمبی ستوان ناک...... میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ یا بالکل پاس پاس، آتے ہی اس نے اپنی کامیابی کا سہرا میرے سر منڈھ دیا۔

اس سے قبل خوشی مجھ سے اتنی بے تکلف کبھی نہیں رہی تھی۔ ہم جماعت ہونے کے ناطے ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے بس۔ لیکن کالج کے الیکشن میں اس کی جماعت میں دو رتین تقریریں کیا کردیں کہ وہ میرے قریب سمٹ آئی۔ اور اپنی کامیابی کا سارا کریڈیٹ مجھے دینے لگی۔ مجھے کھینچ کر کالج کینٹین تک لے آئی۔ میرے ہمراہ کئی اور ساتھی بھی آگئے۔ نعرے کی گونج میں

جیت کا جشن منایا گیا۔ خوب خوب مٹھائیاں چلیں...... اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

اس رات بستر پر میں بہت بے چین رہا۔ ساری رات سو نہیں سکا۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ میں جس کروٹ بھی ہوتا۔ خوشی سامنے ہوتی...... دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔۔ شیشے میں اپنا اترا ہوا، پریشان چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر افسوس شیشے میں بھی خوشی کا چہرہ ابھر آیا۔ وہ مجھے چھیڑتے ہوئے بول رہی تھی۔

''میری کامیابی دراصل آپ کی کامیابی ہے''

''وہ کیسے؟'' میں چونک کر پوچھا۔

''دراصل آپ کی سنجیدہ طبعیت سے ووٹرس بہت متاثر تھے۔ آپ کی شمولیت میری کامیابی کا سبب بن گئی۔''

وہ نہ جانے اور کیا کیا بولتی رہی.......... میں نے تو اپنی آنکھیں اور کان بند کر لئے تھے اور پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ زندگی کے پر خار سفر میں خوشی کی قربت سے میں اپنے غم کو بھول گیا تھا اور تب خوشی کیلئے تارے توڑنے کی خواہش نے انگڑائیاں لیں اور میں نے اپنی بساط بھر کوشش بھی کی۔ ہمت کو سمیٹا اور چھلانگ بھی لگائی مگر زمین پر ان گرا۔ آسمان اور زمین کا سنگم تو بس نظروں کا دھوکا ہی ہوتا ہے۔

والد محترم سے جوان بیٹے کی اداسی دیکھیں نہ گئی۔ انہوں نے فوراً ماموزاد بہن عاصمہ سے میری شادی کر دی۔ عاصمہ قدرے حسین تھی مگر گوتم کی زندگی میں یسودھرا کب ترنگ بھر سکی تھی؟

خوشی کی جدائی نے ایکبار پھر امنگوں اور خواہشوں کی سوت خشک کر دئے تھے لیکن مجھے جینا تھا کہ مفکروں کا کہنا ہے جسم میں مقید روح ہی زندگی کی دلیل ہے اس طرح روح کی موجودگی کا قرض میں ٹکرے ٹکرے ادا کرتا رہا۔ گویا میں نہ جی رہا تھا نہ مر رہا تھا۔ چاروں طرف شعلے اگلتا سرخ سرخ منظر تھا خلفشار اور انتشار کی گرما گرم سرخیوں کے درمیان کھڑا تھا گودھرا

اور گجرات کے ہنگامے کی خبریں سرخیوں میں چھپی تھیں میں ترقی یافتہ دور اس جابرانہ اور ظالمانہ حرکتوں پر حیران تھا کہ سماعت سے یہ آواز ٹکرائی۔

''نہایت ہی افسوس کے ساتھ یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ فلاں صاحب کی والدہ اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئیں بعد نماز عشاء فلاں قبرستان میں سپرد خاک کی جائیں گئیں۔ آپ حضرات شریک نماز جنازہ ہو کر ثواب دارین حاصل کریں''۔

برف میں چنگاری

ڈاکٹر عشرت بیتاب

سابق وزیر اعلیٰ بنگال جناب جیوتی باسو کے ہاتھوں
ڈاکٹر عشرت بیتاب مغربی بنگال اردو اکادمی کا انعام حاصل کرتے ہوئے